TANAZUR

Est. 1977 R. No. 40608/83

تناظر

عصری ادب، آرٹ اور کلچر کا باشعور ترجمان

Nov. 1992

Qamar Jamali

معیاری تخلیقات کی ایک اہم دستاویز

خصوصی شمارہ قمر جمالی کے افسانے

تناظر دہلی

خصوصی پیشکش

افسانوی انتخاب

مدیر ناشر اور طابع

بلراج ورما

قیمت ۴۰ روپے

طباعت سُپر پرنٹرز، ساؤتھ انارکلی، دہلی - ۵۱

پرنٹر پبلشر
پتہ تناظر نئی دہلی پبلی کیشنز
۴۴ ڈی - پاکٹ ۳ - میور وہار - دہلی ۱۱۰۰۹۱ فون ۲۲۵۲۳۱۹

• اکادمی کی مطبوعات •

نمبر شمار	۱۹۸۶ء کی مطبوعات	قیمت
1	دہلی کی آخری شمع۔	23
2	دِلّی والے (جلد اوّل)۔	36
3	دِلّی کا آخری دیدار۔	17
4	قلعۂ معلیٰ کی جھلکیاں۔	17
5	رسوم دہلی۔	28
6	مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے	39
7	بزم آخر	21
8	داغ دہلوی	31
	۱۹۸۷ کی مطبوعات	
9	سوانح دہلی۔	17
10	خواجہ حسن نظامی، حیات اور کارنامے	29
11	عالم میں انتخاب دہلی۔	53
12	دِلّی کی تہذیب۔	17
13	دیوانِ حالی۔	24
14	چراغ دہلی۔	39
15	اردو صحافت۔	32
16	دہلی کے اسکولوں میں اردو نصاب کے مسائل	23
17	نوبت پنج روزہ یعنی وداع ظفر۔	23
18	دِلّی کی آخری بہار۔	20
19	لال قلعہ کی ایک جھلک۔	21
20	ڈائرکٹری اور ناشرین و تاجران کتب	50
21	اردو غزل۔	31
22	اردو مشترکہ ہندوستانی تہذیب	39
23	مرزا محمود بیگ کے مضامین کا انتخاب	31
	۱۹۸۸ کی مطبوعات	60
24	نیا اردو افسانہ تجزیہ اور مباحث۔	60
25	انتخاب کلام داغ۔	34
26	دہلی کے مشائخ کی ادبی خدمات	21
27	دہلی اور اس کے اطراف	25

نمبر شمار		قیمت
28	حواشی ابوالکلام آزاد۔	62
29	اردو میں بارہ ماسے کی روایت۔	49
30	دِلّی کی درگاہ شاہ مرداں۔	33
31	دِلّی والے (جلد دوم)۔	56
32	دِلّی کے آثار قدیمہ۔	48
33	اشاریہ آج کل۔	77
	۱۹۸۹ کی مطبوعات۔	
34	دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر	26
35	مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین	47
36	آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل	61
37	رنگ ہزاروں خوشبو ایک	28
38	کلیاتِ مکاتیبِ اقبال (جلد اوّل)	170
39	نئی تعلیمی پالیسی اور اردو تدریس	30
40	انشا، ہادی النساء مع تحفۃ النساء۔	22
	۱۹۹۰ کی مطبوعات۔	
41	واقعات دار الحکومت دہلی (تین جلدیں)	400
42	آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ۔	48
43	آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم۔	48
44	آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق۔	48
45	آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز و مزاح۔	44
46	آثار الصنادید (تین جلدیں)۔	310
47	فوائد الفوائد۔	86
48	آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ	64
49	آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید۔	70
50	آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ۔	45
51	مہربان جن۔	25
52	اردو مرثیہ۔	67
53	پگڈنڈی جنگل سے کعبے تک	80
54	آدمی نامہ	40
55	غائب منشین	16

تناظر

(اُردو اینتھالوجی) کا یہ شمارہ

تخلیق : قُرۃُ العین حیدر صاحبہ

تنقید : پروفیسر گوپی چند نارنگ

اور

تحقیق : مالک رام صاحب

کی نذر ہے

فہرست

کلدیپ گوہر ۵ تا ۲۹

قمر جمالی ۳۰ تا ۱۲۷

رگھوناتھ گھئی ۱۲۸ تا ۱۳۷

اور

بلراج ورما ۱۳۸ تا ۱۴۴

ترتیب: شامِ یاراں

شعری وافسانوی انتخاب

گُلدیپ گوہر

ادائے شرم

از منشی درگا سہائے سُرور جہان آبادی

سن پیدائش ۱۸۷۳ء سن وفات ۱۹۱۰ء

یہ نگاہِ شرم گیں یہ تیرا اندازِ حجاب
نیچی نظریں ہیں تری یا عقدۂ رازِ حجاب
لب ہیں ہے جاں پروری آنکھوں میں اعجازِ حجاب
دوش پر آنچل ہے یا ہے پردۂ سازِ حجاب

پاک دامانی کی تو سمٹی ہوئی تصویر ہے
جلوۂ حسن تماشا سوز کی تنویر ہے

کہہ رہی ہے چپکے چپکے تیری چشمِ شرم گیں
پیکرِ عفت ہے تو اے نقشِ نازِ دل نشیں
یا زمیں پر جلوہ گر ہے خلد کی اک حورِ عیں
یا کوئی دوشیزۂ رعنا ہے تو اے ناز نیں

کتنے دل کش اور سادہ ہیں ترے جذباتِ حسن
تیری خو بو سے ہے قائم آبروئے ذاتِ حسن

آئینے سے آشنا ذوقِ خود آرائی نہیں
دوش بر دوشِ تحیر نازِ یکتائی نہیں
خود تماشا ہے مگر اپنی تماشائی نہیں
محوِ تمکین و تکبر شانِ برنائی نہیں

اک عجب دل کش مُرقّع تو یدِ قدرت کا ہے
نقشِ سادہ اِک طلسمِ جلوۂ حیرت کا ہے

بھولی بھالی اُف یہ صورت پیاری پیاری یہ ادا
اور یہ شرمیلی چتون اس پہ آنکھوں کی حیا
یہ خمِ گردن کا عالم اور یہ زلفِ دوتا
یہ لبِ شیریں یہ اندازِ سکوتِ جاں فزا

نقشِ عفت ہے مگر تو پردۂ تصویر میں
جلوۂ نورِ ازل ہے حسنِ عالمگیر میں

عشوہ جو تیری نگہ اے لعبتِ خوش خو نہیں
سر پر بولے چڑھ کے جو آنکھوں میں وہ جادو نہیں
جس سے اک عالم پریشاں ہو یہ وہ گیسو نہیں
بن کے خنجر دل پہ چل جائیں یہ وہ ابرو نہیں
یہ نہیں وہ تیرِ مژگاں جن سے بسمل ہو جگر
نشہ رگِ جاں میں جو بن جائے اثر کر نیشتر

نیچی نظریں ہیں تیری بیگانۂ ناز و نیاز
اور عیاں آنکھوں سے ہے معصومیت کا تیری راز
کتنی دل کش ہے تیری اک اک ادائے جاں نواز
ہے چھڑی پھولوں کی یا زیرِ ذقن انگشتِ ناز
کھل کے ہنسنا بھی ابھی گویا نہیں تو جانتی
غنچۂ سربستہ ہے اے شاہدِ رعنا ابھی

اخوذ از "جام سرور"

از منشی مہاراج بہادر برق دہلوی

نسیم صبح

سن پیدائش ۱۸۸۴ء سن وفات ۱۹۳۶ء

اے نسیم صبح اے روح روان بوستاں
مایۂ راحت، سرورِ قلب اے بادِ وزاں
مات ہے تجھ سے شمیم گیسوئے عنبر فشاں
تیری ہر جنبش میں دنیائے لطافت ہے نہاں
غم غلط کن تو برائے خاطرِ افسردہ ہے
تیرا جھونکا تازگی بخشِ دلِ پژمردہ ہے

تیری پیاری شوخیاں بھی کیسی دل آویز ہیں
گدگدانے سے ترے، غنچے تبسم ریز ہیں
موجہائے مشکبو تیری سرور انگیز ہیں
وہ شگوفے بھی ہیں خنداں جو ابھی نوخیز ہیں
تو نے چھیڑا نیم وا کلیوں کی باچھیں کھل گئیں
تیرے دم سے ان کو منہ مانگی مرادیں مل گئیں

تو چمن میں آئی عشقِ گل کا دم بھرتی ہوئی
چھاؤں میں تاروں کی گن گن کر قدم دھرتی ہوئی
پہلے آہستہ چلی اٹھکیلیاں کرتی ہوئی
پھر وہی برتیں ادائیں روز کی برتی ہوئی
گل کو چھیڑا طرۂ سنبل پریشاں کر دیا
غنچۂ نوخیز کا صد چاک داماں کر دیا

لطفِ سیرِ بوستاں تجھ سے دوبالا ہو گیا
تیری شوخی سے نیا رنگِ تماشا ہو گیا

شاخِ گل کو تازیانہ تیرا جھونکا ہو گیا
اِس طرح لچکی کہ اِک انداز پیدا ہو گیا

قطرۂ شبنم رُخِ گل سے ڈھلک کر گر پڑے
جیسے ساغر سے مئے احمر چھلک کر گر پڑے

تیرے دستِ شوق سے ٹوٹا حجابِ روئے گل
پُرزے پُرزے ہو گئی رنگیں نقابِ روئے گل

صبح دم چمکا چمن میں آفتابِ روئے گل
ہو گیا اظہارِ حُسنِ لاجواب رُوئے گل

شانِ خوبی جب رُخِ گل سے ہویدا ہو گئی
اور بیتابی دلِ بُلبُل میں پیدا ہو گئی

آتے ہی صحنِ چمن گلزار تو نے کر دیا
گرم حسن و عشق کا بازار تو نے کر دیا

سبزۂ خوابیدہ کو بیدار تو نے کر دیا
نرگسِ بدمست کو ہُشیار تو نے کر دیا

تیرے کیف آمیز جھونکے کان میں کیا کہہ گئے
ہونٹوں ہی ہونٹوں میں غنچے مسکرا کر رہ گئے

آہ! اے نکہت فروشِ خندۂ گل اے نسیم
بھینی بھینی ہے تری موجوں میں پھولوں کی شمیم

گلشنِ ہستی میں جاری ہے ترا فیضِ عمیم
تو ہوائے جانفزا ہے رحمتِ ربِ کریم

فرح بخشِ قلب پھولوں کی کبھی خوشبو نہ ہو
باغِ اِمکاں میں نسیمِ دل کُشا گر تو نہ ہو

تیرے جھونکے شہرت افزا ہیں برائے بوئے گل
باندھتی ہے تو گلستاں میں ہوائے بُوئے گل

کس لیے جامہ میں پھر پھولی سمائے بوئے گل
ایک عالم کو جو تو کر دے فدائے بُوئے گل

تیرے دل آویز جھونکے کیوں نہ ہوں عنبر شمیم
گود پھولوں سے بھری رہتی ہے تیری اے نسیم

دم قدم سے ہے ترے صحنِ گلستاں میں بہار
تو ہے صد زینت دہِ گلشن ہوائے خوشگوار

یہ تبسم زیرِ لب غنچوں کا یہ گل کا نکھار
ہر ادا کا ہے تری مشاطگی پر انحصار

ہر گُلِ تر ہے چمن میں ناز پروردہ ترا
نیم وا کلیاں بھی دم بھرتی ہیں در پردہ ترا

بُلبُلِ نالاں جو ہوتی ہے قفس میں نا اُمید
تو ہی دیتی ہے اُسے فصلِ بہاری کی نوید

غنچہ و گُل کا سُناتی ہے پیام باز دید   از سرِ نو دل میں بھڑکاتی ہے اک شوقِ جدید

بخشا ہے قدرت نے اعجازِ مسیحائی تجھے

دی ہے پژمُردہ دلوں کی چارہ فرمائی تجھے

چھاؤں میں تاروں کی وہ آنا تِرا انداز سے   وہ جگانا نیند کے ماتوں کو خوابِ ناز سے

جیسے سرگوشی کرے کوئی کسی دمساز سے   یا کہے دے کر ٹھوکے یوں دبی آواز سے

لے چُکے انگڑائیاں بس گیسوؤں والو! اُٹھو

نُور کا تڑکا ہُوا، اے شب کے متوالو! اُٹھو

ماخوذ از "مطلع انوار"

از مُنشی دوارکا پرشاد اُفقؔ لکھنوی

اِتّفاق

سن پیدائش ۱۸۶۴ء سن وفات ۱۹۱۳ء

سرچشمۂ مفادِ زمانہ ہے اِتّفاق   زُلفِ ترقّیات کا شانہ ہے اِتّفاق

بہبودئ جہاں کا خزانہ ہے اِتّفاق   جو پھانس لے ہُما کو وہ دانہ ہے اِتّفاق

جس نے اِس اِتّفاق کے سودے سے چاہ کی

سانچے میں اُس نے ڈھال لیں شکلیں رفاہ کی

اوصافِ نیک و خوب کی قسمِ اِتّفاق ہے   جانِ مفاد کے لیے جسمِ اِتّفاق ہے

جس سے مِلے مراد وہ اِسمِ اِتّفاق ہے   افسوں ہے اِتّفاق طِلسمِ اِتّفاق ہے

یہ اِتّفاق شرق ہے خورشیدِ اوج کو

معراجِ فتح اس سے ہے شمشیرِ فوج کو

اس باغِ بے خزاں میں کوئی خار ہی نہیں   نخل ایسا کوئی دوسرا پُر بار ہی نہیں

ابر اس سے بڑھ کے کوئی گہر بار ہی نہیں   لاکھوں فوائد اس کے ہیں دو چار ہی نہیں

تارے فلک کے اس کے فوائد نہ گِن سکیں

سورج سے بھی شمار نہ ہوں۔ انگلیاں تھکیں

اینٹوں کے اِتّفاق نے مسکن بنائے ہیں　　غلّے کے اِتّفاق نے خرمن بنائے ہیں
پُرزوں کے اِتّفاق نے انجن بنائے ہیں　　تنکوں کی یک دلی نے نشیمن بنائے ہیں

ریزوں کے اِتّفاق سے انبار ہو گیا
قطروں کے سیل سے یم زخّار ہو گیا

قائم ہے اِتّفاقِ عناصر سے ہر بدن　　حرفوں کے اتحاد سے ہے ہستیٔ سخن
تاروں کا اِتّفاق ہے بانیٔ پیرہن　　نخلوں کے اِتّفاق سے ہے خوبیٔ چمن

پیروں میں تابِ آمد و رفت اِتّفاق سے
ہے انگلیوں میں حسنِ گرفت اِتّفاق سے

ہر کمپنی دکھاتی ہے اس یک دلی کا کھیل　　پہیوں کے اِتّفاق سے دوڑی جہاں میں ریل
روشن مکان کرتا ہے بتّی سے مل کے تیل　　لذّت رساں زباں کو ہے شیر و شکر کا میل

قائم جو یک دلی کا بہم عہد ہو گیا
پیدا مکھیوں کے لیے شہد ہو گیا

بے اِتّفاق پھولنا پھلنا مُحال ہے　　بے دستگیر گر کے سنبھلنا مُحال ہے
صرف ایک لب سے بات نکلنا محال ہے　　ہوں متّفق نہ پاؤں تو چلنا مُحال ہے

دو دل نہ ایک ہوں تو کوئی کام ہی نہ ہو
دو وقت اگر بہم نہ ملیں شام ہی نہ ہو

دو دل ہوئے جو ایک تو تقدیر لڑ گئی　　بگڑی تمام قوم اگر پھوٹ پڑ گئی
الفت کی دل کے پھٹتے ہی کھیتی اُجڑ گئی　　ٹوٹا جو پُرزہ چلتی ہوں کل بگڑ گئی

ہر ایک کام ہوتا ہے آپس کے ساتھ سے
تالی بھلا بجی ہے کبھی ایک ہاتھ سے

تکلیف ہیں بشر کو جو اس کی کمک ملے　　آلام کو شکست ہو عشرت کو زک ملے
جس شے سے ناامید ہو دل یک بیک ملے　　جس کا کبھی گماں نہ ہو وہ چیز تک ملے

ہر دل میں اِتّفاق کا جو ہر جو بس گیا
امریکہ و فرنگ میں کنچن برس گیا

جوشِ اِتّفاق کا ہو جو ہر ایک رنگ میں　　معشوق بہتر ہی رہے آغوش تنگ میں

ہر کمپنی کے واسطے مُلکِ فرنگ میں
یہ اتّفاق جونک لگاتا ہے سنگ میں
چندے مشن کے اک ہیں ثبوت اتّفاق کا
ہے ذکر کارخانوں سے غائب نفاق کا

اس ملک میں جو نال گڑا ہے نفاق کا
ذکرِ اتّفاقیہ بھی نہیں اتفاق کا
ساماں ہے باپ بیٹوں میں ہجر و فراق کا
سیلاب ہے طلاق کا طوفان عاق کا
کی پائمال جھوٹ نے کھیتی رفاہ کی
بحرِ فنا میں کشتیٔ ثروت تباہ کی

توصیفِ اتّفاق اگر دل نشیں رہے
ہندوستاں میں کوئی نہ اندوہگیں رہے
برسے ہر اک مکان میں ہُن چھجّیں رہے
دیوار اٹھائیں سونے کی سب یہ یقیں رہے
قسمت اُفق نہ چھیتے گی آپس کی پھوٹ سے
جنسِ نفاق بڑھ کے ہے نادر کی لُوٹ سے

ماخوذ از "لمعاتِ اُفق"

از پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی
سن پیدائش ۱۸۸۲ء سن وفات ۱۹۲۶ء

گائے

تو وہ مخلوق ہے خلقت میں نہیں جس کی گناہ
لی ہے قالب میں ترے رُوح محبت نے پناہ
تیری صُورت سے عیاں ہوتی ہے انسان کی چاہ
رس بھری آنکھ، سموئی ہوئی امرت میں نگاہ
نقش ہے دل پہ مرے موہنی صورت تیری
خوب دُنیا کے شوالے میں ہے مُورت تیری

تن سے تیرے ہے عیاں نرمیٔ دل کا جوہر
جوڑ بند ایسے کہ سانچے میں بنے ہیں ڈھل کر
رنگ کالا ہو کہ اُجلا ہو یہ کہتی ہے نظر
بندرابن کی وہ ہے شام یہ متھرا کی سحر
کنگرے سے یہ نہیں چہرۂ نورانی پر
تاجِ قدرت نے سجا ہے تری پیشانی پر

دیکھے جنگل میں کوئی شام کو تیری رفتار بے پیے جیسے کسی کو ہو جوانی کا خمار
مست کر دیتی ہے شاید تجھے قدرت کی بہار وہ اُترتی ہوئی دھوپ اور وہ سبزے کا نکھار
ایک اِک گام پہ شوخی سے مچلنا تیرا
کھا کے جنگل کی ہوا جھوم کے چلنا تیرا

صاحبِ دِل تجھے تصویرِ وفا کہتے ہیں چشمۂ فیضِ خدا، مردِ خدا کہتے ہیں
دردمندوں کی مسیحا شعرا کہتے ہیں ماں تجھے کہتے ہیں ہندو تو بجا کہتے ہیں
کون ہے جس نے ترے دودھ سے منہ پھیرا ہے
آج اِس قوم کی رگ رگ میں لہو تیرا ہے

نام جس کا ہے محبت وہ ہے ایماں تیرا کوئی ہو سب کے لیے فیض ہے یکساں تیرا
زندگی کے لیے محتاج ہے انساں تیرا کون بیمار نہیں بندۂ احساں تیرا
حلق میں دودھ سے تیرے جو تری رہتی ہے
خشک ٹہنی تنِ لاغر کی ہری رہتی ہے

صُورتیں یاد ہیں اُن بچّوں کی پیاری پیاری زندگی کی جنھیں ایک ایک گھڑی تھی بھاری
تیرے دم سے نہ رہی یاس کی حالت طاری ہوگئیں اُن کے لیے دودھ کی نہریں جاری
کتنے گرتے ہُوئے پودوں کو سنبھالا تُو نے
ماں جنھیں چھوڑ چلی تھی انھیں پالا تُو نے

تیرے بچّوں نے کیا اپنے تئیں ہم پہ نثار اپنی گردن پہ لیا پرورشِ قوم کا بار
نظر آتی ہے جو ہر فصل میں کھیتی تیار ہے یہ سب اُن کے لہو اور پسینے کی بہار
اُن کو منظور نہ ہوتا جو مٹانا اپنا
ہند کی خاک اُگلتی نہ خزانہ اپنا

اہلِ دیں نے تجھے جنّت کا سہارا سمجھا اپنے ایمان کی قسمت کا ستارا سمجھا
سُور بیروں نے تجھے جان سے پیارا سمجھا تُجھ کو اکبرؔ نے سدا آنکھ کا تارا سمجھا
آبرو قوم کی ہے تیری نگہبانی پر
یہی دو حرف لکھے ہیں تیری پیشانی پر

نسل بچّوں کے ترے دودھ کے ہیں متوالے جو ضعیفی سے پڑے رہتے ہیں بستر ڈالے

مست رہتے ہیں ترے فیض سے کُنبے والے پیار سے کہتے ہیں "ماتا" تجھے بچّے بالے
تیری الفت سے انھیں منہ نہیں موڑا جاتا
تیری صورت کا کھلونا نہیں توڑا جاتا

میرے دل میں ہے محبت کا تری سرمایا ماں کے دامن سے ہے بڑھ کر مجھے تیرا سایا
یاد ہے فیض طبیعت نے جو تجھ سے پایا عین قسمت جو ترا نام زباں پر آیا
اِس حلاوت سے جو دعوائے سخنگوئی ہے
دُودھ سے تیرے لڑکپن میں زباں دھوئی ہے

ماخوذ از "صبحِ وطن"

از منشی بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی

گنگا

سن پیدائش ۱۸۹۷ء سنِ وفات ۱۹۷۰ء

اِک یم پاک ہے تُو، نام ہے گنگا تیرا آبِ حیواں ہے مجھے آبِ مُصفّا تیرا
صفحۂ ارض پہ ہے نقش ہویدا تیرا نقش پنہاں ہے سرِ عالمِ بالا تیرا
تیری ہستی میں نہاں جوہر لافانی ہے خاک ہمسر ہو جہاں میں کوئی دریا تیرا
تر زباں وید مقدس تری توصیف میں ہیں خوب کھینچا ہے پُرانوں نے سراپا تیرا
تو بڑھاتی ہی رہی حوصلہ بھاگیرتھ[1] کا تیرے دیدار سے شاداں ہُوا جویا تیرا
سرفرازی تجھے کیلاشی پتی نے بخشی پاؤں میں وشنو کے ہے مسکن زیبا تیرا
نظر آئی ہمیں گڑھ میں کبھی مکتیشور کے دیکھا کاشی میں کبھی روئے دِل آرا تیرا
لُطفِ سنگم کا بہم خطۂ پریاگ میں ہے جادۂ پاک ہے ہم پہلوئے جمنا تیرا
لے لیا گود میں بنگال کی کھاڑی نے تجھے عہدِ طفلی میں تھا کیلاش ہنڈولا تیرا

---

[1] راجہ بھاگیرتھ ہندو پُرانوں کی روایات کے مطابق دنیا میں گنگاجی کے ظہور کا باعث بھاگیرتھ کی ریاضتِ شاقہ تھی۔

آریہ ورت کے خطّہ کو بنایا بے مثل ۔ تا ابد یوں ہی تعلق رہے اُس کا تیرا
تجھ سے تاریخ سلف ہند کی وابستہ ہے ۔ داستاں اُس کی وہی ہے جو ہے قصّہ تیرا
رام تیرتھ کی سمادھی سے نہ پھر آنکھ کھُلی ۔ ڈوب جاتا ہے ترے عشق میں شیدا تیرا
جوشِ مستی میں تیرا جھوم کے لہریں لینا ۔ آہ وہ ناز سے انداز بدلنا تیرا
دور تر دامنی ہو جاتی ہے تیرے جل سے ۔ پار دُنیا سے لگا تا ہے کِنارا تیرا
نہ کبھی دولتِ دیدار سے محروم رہوں ۔ حُسن دیکھا ہی کرے چشمِ تمنّا تیرا
رہے جب تک مرا ویرانۂ ہستی میں قیام ۔ مثلِ مجنوں مرے سر میں رہے سودا تیرا

تیرے پانی سے مری گردِ جہالت دھو جائے
اور مِٹ جائے مرے دل سے یہ میرا تیرا

منقول از "کائناتِ دِل"

از تلوک چند محروم

سُرورِ ازل

سن پیدائش ۱۸۸۷ء سنِ وفات ۱۹۶۶ء

شہنشاہ بابر اور گورو نانک دیو کا مکالمہ

بابر

ہماری بزمِ عشرت میں جو لے آیا خُدا' بابا ۔ تو بسم اللہ! جام بادۂ احمر چڑھا' بابا
جہاں میں آب رز سے کونسا ہے پاک تر پانی ۔ کہ دُھل جاتا ہو جس سے دفترِ ماؤ شُما بابا
نہ میخانے کو دیکھا چاہیئے چشمِ حقارت سے ۔ کہ ہوتی ہے یہیں سے بیخودی کی ابتدا' بابا
نہ یُوں ہی میکشوں کو خاک پر بیٹھا ہوا دیکھو ۔ پہنچتی ہے نظر اُن کی سر فوقِ السّما' بابا
صدا حق حق کی سُنتے ہیں سدا وہ شیشۂ مے سے ۔ اِسی سے دِل ہیں رندوں کے حقیقت آشنا' بابا
صُراحی کھولتی ہے رازِ دل جب بانگِ قُلقُل سے ۔ فلک سے ہیں پکار اُٹھتے ملائک "مرحبا" بابا
نہ ہو گلبانگ مستوں کی تو دُنیا بزمِ ماتم ہے ۔ ہمارے دم سے کچھ کچھ زندہ ہے دارالفنا' بابا

غنیمت جان کر صحبت کو اِک دو جام پیتا جا
میانِ محفلِ رندان دُردِ آشام پیتا جا!

گورونانک دیو

مبارک ہو مئے احمر تجھے، صاحبقراں تیری
رکھے بس سُرخرو تجھ کو شرابِ ارغواں تیری

دلِ فرخندہ تیرا واقفِ رمزِ حقیقت ہے
اگر ہے ترجمانِ دل حقیقت میں زباں تیری

مگر جب کیفیت دل میں ہے کیفِ مے کی حاجت کیا
غرض محفل سے کیا خلوت ہو جب رشکِ جناں تیری

مے انگور پی کر کوئی متوالا ہوا تو کیا؟
رہا بے کیف دل شغلِ مے و مینا ہوا تو کیا؟

وہ مے اپنی ہے جس سے بن پئے مخمور رہتے ہیں
خیالِ چشمِ ساقی کے نشے میں چوُر رہتے ہیں

وہ میکش ہیں کہ مہر و ماہ اپنے جام و ساغر ہیں
جو صہبائے مروّق سے سدا بھرپور رہتے ہیں

ہمارا دورِ مے ہر ہر نفس کے ساتھ چلتا ہے
اسی سے ہر نفس ہر لحظہ ہم مسرُور رہتے ہیں

کثافت روح میں آلائشِ دنیا سے آتی ہے
شرابِ ظاہری سے اہلِ باطن دور رہتے ہیں

چڑھا دو اُن کو سُولی پر بھی تو حق حق سُناتے ہیں
جو عاشق ہیں وہ سرشارِ مئے منصور رہتے ہیں

لنڈھائے ہوں جنھوں نے خُم کے خُم صہبائے عرفاں کے
کہاں وہ طالبِ افشردۂ انگور رہتے ہیں

مُناسب ہے یہی، ترکِ مے انگور کر شاہا!
ہمارے جام سے تھوڑی سی اب منظور کر شاہا!

ماخوذ از "گنجِ معانی"

شاعری

چودھری جگت موہن لال رواںؔ

شاعری کیا ہے اِک احساسِ قوانینِ وجود
دِل کے جذبات کا اظہار بتا ئیدِ قیود

برہمن ہے دلِ شاعر بُتِ فطرت معبُود
جلوہ پیرائے ازل کا ہے یہاں حُسنِ نمود

جب نظر راز کے پردوں سے گزر جاتی ہے
دل کے آئینے پہ تصویر اُتر آتی ہے

اُسی تصویر کا اِک رُخ ہے یہ دنیائے لطیف ناظمِ کون و مکاں ہے یہ ہے اُس کی تعریف
ہے زباں اس کے ادا کرنے کو اِک جزوِ ضعیف منبرِ بارگہہ خاص ہے یہ فنِ شریف

پردہ اسرارِ مجازی کا اٹھانے والا
آئینۂ رُوئے حقیقت کو دِکھانے والا

دِل ہے شاعر کا کہ اِک منظرِ انوارِ جمال اور جولانگہ دِل وُسعتِ میدانِ خیال
نغمہ زن ہوتا ہے جب مستِ سخن صاحبِ قال بزمِ فطرت میں ہر اِک چیز کو آجاتا ہے حال

کوہ جُھک جاتے ہیں اشعار کی موسیقی سے
چشمے رُک جاتے ہیں اشعار کی موسیقی سے

نورِ شمعِ دِل و جاں دائرۂ شعر میں ہے وُسعتِ کون و مکاں دائرۂ شعر میں ہے
جلوۂ برقِ طپاں دائرۂ شعر میں ہے الغرض سارا جہاں دائرۂ شعر میں ہے

جس بلندی پر فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں
تیرے شاعر اُسے ٹھکراتے ہوئے چلتے ہیں

پیاری اُردو تیری محفل میں سخن ور کم ہیں سنگریزے تو بہت ملتے ہیں جوہر کم ہیں
چوٹ لگ جائے جن اشعار سے دل پر کم ہیں جن میں پنہاں ہوں خیالات کے دفتر کم ہیں

میرؔ سمجھا تھا فقط معنی اسرارِ سخن
ختم غالبؔ پہ ہوئی گرمئ بازارِ سخن

اللہ اللہ زہے وُسعتِ دامانِ غزل بُلبُل و گل ہی پہ موقوف نہیں شانِ غزل
ختم پہنائے دو عالم پہ ہے پایانِ غزل پوچھئے حافظِ شیراز سے امکانِ غزل

ضبط ہے آئینۂ رازِ حقیقت اِس میں
یہ وہ کوزہ ہے کہ دریا کی ہے وُسعت اِس میں

ماخوذ از "رُوحِ رواں"

نریش کمار شاد

جھومتی ہیں وہاں بہاریں سی
ناچتے ہیں وہاں ستارے سے
وہ نظر جس میں تم سما جاؤ
کم نہیں ہے کسی نظارے سے

ابرِ رحمت نے پردہ داری کی
آج میری گناہ گاری کی
لب تک آیا ہے جونہی ساغرِ مے
ہر طرف چھا گئی ہے تاریکی

دل پہ گزری جو واردات نہ پوچھ
میری خوش قسمتی کی بات نہ پوچھ
بے ہنر مجھ سا بن گیا محسود
دوستوں کی نوازشات نہ پوچھ

ہم نے اپنے لہو کی بوندوں سے
لوگ کہتے ہیں غم کو پالا ہے
کون سمجھے گا دوستو لیکن
غم نے دراصل ہم کو پالا ہے

زندگی! اپنے آئینے میں تجھے
اپنا چہرہ نظر نہیں آتا
ظلم کرنے کا حق تو ہے تجھ کو
ظلم سہنا مگر نہیں آتا

ہم جو ہر وقت رنج سہتے ہیں
ظاہراً گو خوش رہتے ہیں
ہم نشیں! دل کی واردات مگر
ہم نظر کی زباں سے کہتے ہیں

ہماری یاد میں پیرِ مغاں روتے ہیں پیمانے صراحی لے رہی ہے ہچکیاں روتے ہیں پیمانے

اے شاد رہبروں کے رویے کو دیکھ کر آنا پڑا ہے راہ زنوں کی پناہ میں

اسی لیے ہمیں کہتے ہو تم چمن دشمن کہ ہم خزاں میں بھی ذکرِ بہار کرتے ہیں

حسینو! جس سے مل کر ہنس رہے ہو مری خوش قسمتی ہے میں نہیں ہوں
یہ تنویرِ ازل ہے تم نہیں ہو یہ میری بے خودی ہے میں نہیں ہوں

جینے کا سہارا

صالحہ عابد حسین

رات سے وہ بہت اداس تھا۔!

بچپن کی یادیں، جب ماں کی آغوش کی گرمی باباکی شفقت کی چھاؤں، بہنوں کی الفت اس پر نثار ہوتی رہتی تھی۔ جوانی میں بھائیوں اور ساتھیوں کی دوستی اور محبت اس کے نوجوان ذہن کو محبت کی غذا پہنچاتی تھی! کس قدر پیار کرتے تھے بڑے بھیّا اس سے! بالکل بیٹوں کی طرح چاہتے اور بھابی۔ وہ تو ماں کے بعد بالکل ماں کا سا پیار دیتی تھیں۔ سہیلیوں کی طرح اس کے دکھ سکھ کو سنتی تھیں ــــ ہائے بڑی باجی اور منجھلی آپا کی الفت وہ کیسے بھولے؟ اور یہ سب مل کر جب اس کی سالگرہ منایا کرتے ــــ وہ سب سے چھوٹا تھا نا! کیا رونق، چہل پہل اور پیار کی برکھا ہوتی تھی۔ بھتیجے بھتیجیاں، بھانجے بھانجیاں سبھی سے دوستی اور بے تکلفی تھی۔ وہ سب کو چاہتا بھی تو بہت تھا! سب کو تحفے لا کر دیتا۔ سیریں کراتا ــــ اور ماں باپ کے غصے سے بچایا کرتا تھا!

اور بیوی! آہ ــــ وہ اس کی محبوبہ، دوست ساتھی، رفیق یگانہ تھی! جب دور شہر میں اس کا کام لگا تو وہی تو تھی جس نے مصیبت ــــ بیماری تکلیف خوشی اور دکھ سکھ میں اس کا یوں ساتھ دیا کہ جیسے وہ ایک جان دو قالب ہستیاں ہوں۔ اولاد رشک کرتی: اماں اور ابو میں کتنا

پیار ہے ؟ ہم تو تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کوئی دو آدمی یوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ وہ بیمار ہوتا تو بیوی پر دن کا چین رات کی نیند حرام ہو جاتی ہر کام سے، بچوں تک سے۔ بس ہو کر بس اس کی پٹی سے لگ کر بیٹھ جاتی۔ اور جب بیوی بیمار ہوتی یا بچے بیمار ہوتے تو اس کی جان پر بن جاتی تھی! کسی کام میں دل نہ لگتا۔ ہر وقت اس کی خدمت، دوا علاج کے لیے بھاگ دوڑ دل داری اور اس کو خوش رکھنے کی کوشش۔ بس یہی زندگی کا مقصد رہ جاتا۔

لوگوں کو رشک تھا ان کی زندگی پر۔ چاہنے والے کہتے کہیں نظر نہ لگ جائے ایسے جوڑے کو۔ پیارے پیارے ہونہار بچے، میاں بیوی کی محبت ایسی بے مثال، اور خاصی خوشحال زندگی تھی اور اگر تنگی تھی بھی تو پیار اور مفاہمت سب کو گوارا بنا دیتی!

بابا اور ماں تو بہت پہلے ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ مگر بھائی صاحب بھابی اور بہنوں کی دلداری اور محبت نے زخم پر مرہم رکھا۔ شادی ہوئی تو بیوی نے دنیا ہی بدل دی تو راحت کا سرکل مکمل ہو گیا۔

ذہین اور قابل بچے ترقی کرنے لگے۔ اعلیٰ امتحان پاس کیے۔ کسی کو ہندوستان میں اچھا عہدہ مل گیا! ایک لڑکی کی کامیاب شادی ہو گئی دوسری اس کے پاس رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی رہی اور چھوٹا بیٹا لکھنؤ میں تعلیم پانے لگا۔ اور پھر — پھر زندگی نے — خوشیوں کا تاوان لینا شروع کر دیا۔!

بھابی اچانک دل کے دورے میں ختم ہو گئیں۔ اور بڑے بھیا — بڑھاپے میں بے سہارا رہ گئے۔ ان کے بچے ...... تو پہلے ہی اپنا گھر بسا کر دور دیس چلے گئے تھے! ان کی موت کتنی دردناک تھی! انتقال ہوا تو نوکر کے سوا کوئی پاس نہ تھا۔ اسے بھی بعد میں خبر ملی۔

اور پھر بڑی باجی اولاد نہ ہونے کا دکھ لیے تنہا ویران زندگی بسر کر کے خدا کو پیاری ہو گئیں۔ ان کے میاں نے تو چھوڑ ہی دیا تھا۔ بڑی باجی جو اسے اپنا بیٹا کہتی ہی نہیں بلکہ سمجھتی بھی تھیں۔ آخر وقت اسی نے اور بیوی نے جتنی خدمت ان کی ہو سکتی تھی کی۔ منجھلی باجی تو سب کو چھوڑ کر پاکستان جا کر بس گئی تھیں۔ ان کے میاں کو جائیدادیں الاٹ ہو گئی تھیں اور بچوں کو گلف کے ملکوں اور امریکہ میں بڑی بڑی نوکریاں مل گئی تھیں۔ سنا ہے جب ان کے میاں کا انتقال ہوا تو ان لوگوں نے ان کا مرنا اس قدر دھوم دھام سے کیا کہ کوئی شادی میں بھی اتنا خرچ نہیں کرتا......

آہ ــ کوئی مر کر چھوٹا ــ کوئی زندگی میں بچھڑ گیا! کاش ــ کاش میری بیوی زندہ رہتی! اس کے دم سے تو زندگی زندگی تھی اب وہ زندہ نہیں زندگی کے کاندھے پر ایک لاش ہی تو ہے جو اس کی محبت کی لاش کو اپنے سینے سے لگائے زندگی کے یہ دن بتا رہا ہے۔

اس کی نظر سامنے لگی بڑی سی تصویر پر پڑی جس میں وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے، ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ یہ رنگین تصویر ان کی شادی کی سالگرہ پر بچوں نے بنوائی تھی! کس قدر شوق اور محبت سے بچے ان کی سالگرہ منایا کرتے تھے۔ وہ اس کی سالگرہ پر بہت اہتمام کرتی خاص کر پچاسیوں سالگرہ پر تو خاندان بھر کو جمع کیا تھا بڑی سی دعوت تحفے، اپنے اور بھائی بہنوں اور سسرال والوں اور دوستوں کے جوان بچوں کا جشن منانا ــ اس کے منع کرنے کے باوجود اس قدر اہتمام ہوتا۔ اور وہ سب کہتے امی ہم اپنے بابا سب اے بابا تو کہتے تھے کہ ساٹھویں سالگرہ بہت دھوم اور شان سے کریں گے!

"بڈھے کی" وہ ہنستا تھا!

آپ کبھی بڈھے نہ ہوں گے۔ اب بھی جوان ہیں ــ ہم سے زیادہ شاداب، خوب صورت اور زندگی سے بھرپور ــ تب بھی ایسے ہی رہیں گے۔ اس دن ہم آپ دونوں کو دولھا دولہن کی طرح سجائیں گے .... جانے کیا اور کہا؟

دولہا ــ دلہن ــ ساٹھویں سالگرہ ــ جشن! ــ مسرت۔

کہاں ہیں وہ سب جنھوں نے یہ منصوبے بنائے تھے؟

اس کی جان اس کی روح اس کا ساتھ چھوڑ گئی! آہ وہ جان لیوا مرض۔ اس نے پیسہ پانی کی طرح بہادیا ــ پینشن بیچ دی۔ مگر ــ مگر وہ اس کا ساتھ چھوڑ گئی! آہ وہ اس کی آخری بے بسی کی نگاہیں "جان" (وہ دونوں ایک دوسرے کو یہی کہا کرتے تھے)

"جان تم تنہا رہ گئے ــ تمہیں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ صبر و برداشت کی وہ کون سی قوت تھی جو اتنے دن سے اُسے سنبھال رہی تھی! اس نے مسکرا کر اُسے سہارا دیا ــ

"نہیں تم اچھی ہو رہی ہو" اور دل میں کہا ابھی تو وقت آنا ہے سچی رفاقت کا "میری جان ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ تمہارے بغیر میں مر جاؤں گا"

مگر کون مر سکتا ہے کسی کے ساتھ! وہ آج اتنے برس بعد بھی زندہ ہے۔ زندگی ـــــ یہ زندگی جس میں بیماریاں ہیں، تنہائیاں ہیں، مزاج اور طبیعت کے خلاف باتیں ہیں، عزیزوں اور دوستوں کی بے اعتنائیاں ہیں اولاد کی بے نیازی اور بڑھاپا ـــــ بیماری ـــــ تنہائی ـــــ نانی اماں کہا کرتی تھیں "جیسے لاڈ گھنیرے اُسے دکھ بہتیرے ـــــ" اور پھر نانی اپنے بچپن کو یاد کرنے لگتیں۔ جب سارا خاندان اسی اکلوتی چہیتی لڑکی پر فدا تھا۔ اور پھر اپنے شوہر، اس کے نانا کے گزر جانے کے بعد ـــــ ان کا کہنا تھا کہ کس طرح وہ تنہا رہ گئیں۔ بزرگ پہلے ہی خدا کو پیارے ہو گئے تھے۔ شوہر جیسے بھی تھے ان کا سہارا تھے، کم سے کم وہ انھیں چاہتے تھے۔ مگر ان کے بعد۔ بہو اور بیٹے نے تو چھوڑ ہی دیا۔ بیٹی اور داماد نے بھی۔ ہاں ہاں میرے بچے یہی تیرے ماں باپ اب کون میری پروا کرتا ہے بچے ـــــ دیکھ دالان کے اس کونے میں پڑی ہوں۔ دو وقت کھانا ناشتہ دے کر سمجھتے ہیں سب فرضوں سے ادا ہو گئے۔ ارے کوئی گھنٹے دو گھنٹے پاس آ کر نہیں بیٹھتا۔ میرے دل کی حالت کوئی نہیں سمجھتا ـــــ میرا دکھ نہیں بٹاتا ـــــ جیسے میں پتھر ہوں۔ جس کے دل پر صدموں پر صدمے پڑ رہے ہیں۔ جس کی دنیا لٹ گئی ـــــ بیٹے نے چھوڑ دیا ـــــ ارے کوئی تو پوچھے کہ مجھ پر کیسا گزر رہی ہے ـــــ یوں بھرا خاندان ہے۔ مگر آتے بھی ہیں تو سلام کر کے یوں گزر جاتے ہیں جیسے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ طبیعت بھی پوچھیں گے تو جواب نہ سنیں گے۔ میں نے اپنے کانوں سے سنا کہتے ہیں۔ بس وہ تو اپنی بیماریوں کا راگ الاپنے لگتی ہیں۔۔۔۔ پوچھو کس کے پاس اتنی فرصت ہے۔۔۔۔۔"

نانی اماں یونہی بگڑتی رہتیں اور وہ ان سے سٹ کر بیٹھ جاتا۔ نانی اماں ـــــ دنیا میں یہی ہوتا ہے۔ دیکھئے نا سب اپنے اپنے کاموں میں کس قدر مصروف ہیں ـــــ بوڑھے لوگوں کو دینے کے لیے آج کل کے زمانے میں کس کے پاس وقت ہے؛ آپ تو کتابیں پڑھا کیجئے۔ عبادت تو کرتی ہی رہتی ہیں ـــــ اور ہاں میں آپ کے لیے ایک ریڈیو خرید کر لاؤں گا جب نوکر ہو جاؤں گا۔ اسی کو سنا کیجیے گا۔ اور بچوں کو قرآن پڑھایا کیجیے ـــــ " جانے وہ کیا کیا ان کو سمجھاتا رہتا۔ وہ اس کی بلائیں لیتیں۔ گلے لگاتیں۔ "اے تو جیتا رہے سو برس۔ نانی کی جان۔ تو ہی تو ہے۔ کتنا میرا خیال کرتا ہے جب کالج کی پڑھائی سے چھٹیوں میں آتا ہے۔ تو بھی تو نئے زمانے کا ہے۔ اللہ ایسی اولاد سب کو دے۔

وہ مسکراتا ہے۔ نانی اسے ایک نسل اور دو نسل کا فرق کہا جاتا ہے — بات یہ ہے کہ ان میں — ان میں ہے۔ وہ آگے کچھ نہ کہتا کہ نانی اماں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے۔ وہ کہنا چاہتا تھا ان کے خیالات اور دلچسپیوں اور ہر چیز میں بہت فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے — اور پھر بڈھوں سے وہ لگاؤ کہاں ہوتا ہے.....

آج نانی اماں کی اتنی یاد کیوں آرہی ہے ہاں کیوں نہ آئے۔ آج وہ نانی اماں کی جگہ لے چکا ہے۔ وہ تنہا ہے — اداس ہے — اس میں دوسری نسل میں جنریشن گیپ — GENERATION GAPS پیدا ہو چکا ہے۔ تاریخ اپنے کو دہرا رہی ہے۔ وہ ان کا زمانہ تھا۔ اس وقت گھر میں کتنے لوگ ہوتے تھے تنہا ہوتے ہوئے بھی تنہائی نہیں ہوتی تھی — اور آج — آج کی زندگی — مصروفیت کی زندگی خود غرضی کی زندگی — بھاگ دوڑ کی زندگی خود پرستی اور حرص و لاپرواہی کی زندگی۔ ہر ایک کو اپنی پڑی ہے۔ ایک ساٹھ سالہ بوڑھے کو کون پوچھے۔ کون وقت دے۔ اس کے جذبات اور احساسات کا خیال کرے..... بس چاہنے والے — جان نچھاور کرنے والے تو اس دنیا کو چلے گئے جہاں سے کسی کی خبر تک نہیں آتی۔ بچے — جو اپنی اپنی زندگی میں مگن ہیں — بہن بھائیوں کی اولاد، دوستوں کے خاندان والے کیوں پوچھیں گے — اور جو ایک دو دوست رہ گئے ہیں — وہ بھی اس کی طرح تنہا ہیں۔ بیمار ہیں — زندگی سے بیزار ہیں — مگر وہ تو زندگی سے بیزار نہیں۔ وہ تو اب بھی لڑ رہا ہے اس سے — زندگی کی شمع کی لو جلائے رکھنے کے لیے کیا کیا جدوجہد نہیں کر رہا ہے۔ گٹھیا چلنے نہیں دیتی مگر وہ چلتا ہے۔ نگاہ کمزور ہو گئی مگر وہ لکھتا اور پڑھتا ہے۔ دل ساتھ نہیں دے رہا مگر وہ اُسے سنبھالے ہے مگر جذبات اور احساسات — آہ! یہ اُسے کچلے دے رہے ہیں!

اس تنہا ویران زندگی سے تو — تو کہیں بہتر ہے کہ وہ بچھڑے قافلے سے جا ملے۔ یہ چند عزیز اور پڑوسی اور اس کی سب سے چھوٹی بیٹی — اگر ان کی محبت اور رفاقت حاصل نہ ہوتی تو — تو — وہ کیا کرتا! بیوی کے داغ کو یادوں کی صیقل سے چمکائے وہ اب بھی کام کرتا رہتا ہے — عبادت کرتا رہتا ہے — لوگوں سے تعلقات بنانے کی کوشش کرتا ہے! اس میں اُسے کچھ سکون ملتا ہے۔ نہیں تو بیٹے کی بے نیازی، بڑی لڑکی کی دوری اور بے پروائی اور — اور —

صبح کی اذان کی آواز آئی۔ رات بیت گئی۔ جاگتے ہی! ساتھ ہی وہ پلنگ سے اُٹھ بیٹھا۔ صبح
ا پو پھٹ رہی ہے اور اس کی ساٹھویں سالگرہ۔ ساٹھ سال! اُف!
کہاں ہیں وہ سب چاہنے والے۔ آؤ دیکھو آج میں اکیلا ہوں۔ بس تمہاری یادیں میرے
میں جشن منا رہی ہیں!

اس نے تڑپتے دل کو سنبھالا اور خالق حقیقی کی بارگاہ میں سر جھکا دیا!

کوئی نہ ہو۔ وہ تو ہے!

آٹھ بجے وہ ناشتہ کی میز پر بیٹھ گیا۔ ملازم نے ناشتہ لگا دیا تھا!

اُسے اس وقت بے اختیار "منو بیٹیا" یاد آنے لگی۔ اگر وہ ہوتی تو یہ دن اتنا سونا نہ لگتا!
گر اس نے اصرار کر کے اُسے باہر بھیج دیا تھا اتنا اچھا چانس ملا تھا اور وہ باپ کی خاطر جانے سے
نکار کر رہی تھی! اس نے کہا تھا نہیں میں یہ سال جھیل لوں گا تم اپنا مستقبل نہ خراب کرو۔ جاتے
وقت کہا تھا ابو میں جلدی آؤں گی اور ہر ہفتے نہیں ہر روز خط لکھوں گی۔

ساتھ کے گھر سے اس کا بھانجہ "خدا حافظ ماموں جان" کہتا تیزی سے بریف کیس لیے
گزر گیا۔ ذرا دیر میں دونوں لڑکیاں ماموں جان ہم جا رہے ہیں کہہ کر اسکول اور دفتر چلی گئیں،
دوسرے افراد اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے!

اس کے دل میں ایک ٹیس سی اُٹھی! نہیں کسی کو یہ یاد نہیں کہ آج اس کی ساٹھویں سالگرہ ہے!
ل وہ سب پیارے اس دنیا سے جا چکے ہیں یا اس کی دنیا سے دور ہیں جو اس جشن کو منانے کے
اب دیکھا کرتے تھے۔ بیٹا تو دو قدم پر ہے۔ وہی آسکتا تھا! فون کرسکتا تھا، تار ہی دے دیتا۔
احساس تو نہ ہوتا کہ وہ سب کے ہوتے ہوئے تنہا ہے۔ وہ کوئی بچہ نہیں! کہ اُسے سالگرہ منانے
کا شوق ہو۔ مگر اپنے بچوں کی محبت اور قرب کی ــــ اسی بہانے اس کی خواہش تھی۔ کتنے دن
سے وہ اس شہر میں رہتے اپنے بھائی بہن کی اولاد سے نہیں مل سکا ہے۔ اس نے سوچا تھا شاید وہ
لگ آجائیں! ــــ اس نے برائے نام ناشتہ کیا ــــ اور میز سے اُٹھ رہا تھا کہ سامنے سے پوسٹ
مین آتا نظر آیا۔ بے اختیار وہ اس کی طرف بڑھا۔ اس نے ایک خط ہاتھ میں پکڑا دیا! فارن لیٹر۔
ن کی بیٹی کی تحریر۔ دل دھڑک اٹھا بے قراری سے اس نے خط کھولا۔

پیارے ابو :

ساٹھ سال تک اس دنیا میں رہ کر آپ نے مختلف حیثیتوں سے اپنا رول اس کے اسٹیج پر بہترین اداکاری کے ساتھ ادا کیا۔ اپنی ذات سے لوگوں کو سکون عافیت اور محبت کا احساس دلایا اپنی محرومیوں کو اس طرح اپنے اندر چھپا کر رکھا کہ کبھی کسی کو ان کا احساس بھی نہ ہونے دیا۔ آپ نے وقت کے ساتھ بہت خوب صورتی اور وقار کے ساتھ COMPROMISE کیا۔ زندگی کا مقابلہ حوصلے سے کیا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ زندگی سے لڑنے کا حوصلہ آپ میں آج بھی ہے۔ کتنی خوشی کی بات ہے کہ آپ آج اپنی زندگی کے ساٹھویں درجے میں قدم رکھ رہے ہیں تو اس طرح کہ آپ کا حوصلہ بلند ہے آج بھی آپ دوسروں کے لیے ناگزیر ہیں۔ آپ کو لوگوں کی طرف نہیں دیکھنا ہوتا وہ آپ کی طرف محبت اور مدد کے لیے دوڑتے ہیں۔ آپ وہ مرکز ہیں جس کے گرد سب گھوم رہے ہیں۔ آپ میری زندگی ہیں میرا حوصلہ میری مسرت میری عافیت اور کیا کیا نہیں ہیں ؟

تندرستی حوصلے اور ہمت کی دعاؤں کے ساتھ آپ کی بیٹی۔

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو خط پر گر رہے تھے اور تڑپتے دل کو جیسے کسی نے تھام لیا تھا !

فون کی گھنٹی بجی ۔ اور بجتی چلی گئی۔ اس کے دونوں دوست کئی پرانے کولیگ فون پر مبارکباد دے رہے تھے ! اتنے میں سامنے سے اس کی چچازاد بہن اور اس کے بچے ٹیکسی سے اترتے نظر آئے۔ ان کے ہاتھ میں کیک کا بڑا سا ڈبہ تھا !

اس نے آگے بڑھ کر سب کو بازوؤں میں تھام لیا ! برف کی سل پگھل گئی تھی ! زندگی میں اوشا کی کرن چمک اٹھی تھی !

یہ سہارے نہ ہوں تو انسان کیسے زندہ رہے !
ہاں دو نسلوں میں بھی محبت اور دوستی کی شمع روشن رہ سکتی ہے !

اللہ دے بندہ لے

رضیہ سجاد ظہیر

جب فخرو سرسی سے سنبھل آیا تو اس نے دھوتی کی جگہ تہمد باندھا، کمری اتار کے کرتا پہنا، سنبھل سے مراد آباد پہنچا تو تہمد کی جگہ پاجامے نے اور کرتے کی جگہ قمیض نے لے لی۔ سرسی میں وہ الف کے نام لٹھا نہیں جانتا تھا، سنبھل میں ہمارے ماموں نے اس کو اُردو لکھنا پڑھنا اور اے، بی، سی، ڈی سکھائی اور مراد آباد پہنچ کر تو وہ اتنا تیز ہو گیا کہ ہمارے بیرسٹر ماموں جو انگریزی کی کتاب کہتے وہ الماری میں سے نکال لاتا۔ قانون کی ایک ایک کتاب پہچاننے لگا۔ سب قصے، داستانیں، رسالے ناول اسے معلوم ہو گیے۔

لیکن اس تمام ترقی کے باوجود ایک کمی اس کی شخصیت میں رہ گئی کہ وہ بوٹ جوتا نہیں خرید سکا۔ بوٹ اس وقت بھی کافی مہنگے تھے، اور پانچ روپیہ مہینے میں سے تین روپیہ گھر بھیجے اور ایک روپیہ فاخری دادی کے پاس جمع کرانے کے بعد بچتا ہی کیا تھا جو فخرو بوٹ جوتا بھی خرید لیتا۔ دو آنہ مہینہ مسجد کی چراغی، دو آنہ یتیم خانہ کا چندہ، پھر مہینے میں دو بار حجامت، بیڑی، ماچس سر کا تیل، کپڑے دھونے کا صابن ـــــ یہ سب کوئی مفت تو آتا نہیں تھا ـــــ ا؛ نے اس کی شخصیت میں یہ کمی رہ گئی ـــــ اور دوسری کمی اس کی ذہنیت میں رہ گئی ـــــ

ـــــ کہ وہ نماز پڑھنے سے برابر انکار کرتا چلا گیا ـــــ ترقی کے کسی بھی اسٹیج پر اس نے نماز نہیں پڑھی، اس معاملہ میں ہمارے بیرسٹر ماموں کو اس کا یہ برسی کے اڑیل بیلوں والا رویہ سخت ناپسند تھا۔

بیرسٹر ماموں کئی سال ولایت رہے تھے، سوٹ پہنتے تھے، انگریزی فروٹ بولتے تھے مگر نماز پانچوں وقت کی پڑھتے تھے۔ جب وہ نماز کے لیے بآواز بلند اذان دیتے تو باقی گھر والوں کی سٹی گم ہو جاتی تھی اور ہر شخص اُن کی گرجدار آواز کے رعب میں آکر فوراً نماز پر کھڑا ہو جاتا تھا۔ ہمارے نانا جب تک جئے اس بات پر فخر کرتے رہے کہ اُن کے کئی دوستوں کے بیٹے تو ولایت جا کر اپنا دین ایمان بھول گئے۔ مگر ان کا بیٹا اتنے دن انگلستان رہنے کے باوجود بھی پانچوں وقت کی نماز پڑھتا اور تیسوں روزے رکھتا تھا، اجی اس کی نماز کی تو رنڈیاں تک بھی قائل تھیں، ایسی جنے کتنی ہی عورتوں کو اس نے نماز سکھا کے اس نے ان گمراہوں کی عاقبت سنوار دی تھی۔ اس لیے تو ماموں کہتے تھے کہ فخرو کے ہاتھ کا تو پانی بھی نہ پینا چاہیے، یہ کبھی ایک ٹکر نہیں مارتا۔ اس کے دل پر تو اس نے مہر لگا دی تھی، وہ بے چارے کیا کرتے، اب اگر کوئی خود ہی جہنم کا کندہ بننا چاہیے تو کوئی کر بھی کیا سکتا ہے۔

فخرو روزے تیسوں رکھتا تھا، رمضان بھر جو کچھ ہو سکتا خیرات کرتا مسجد میں آنے والوں کے لیے باہر کی لالٹین میں دو پیسے روز کا تیل اپنے پاس سے ڈلواتا تاکہ راستے پر روشنی رہے اور لوگوں کو آنے جانے میں آسانی ہو ـــــ پر خود مسجد کے اندر نماز پڑھنے کبھی نہ جاتا ـــــ اور کاموں سے پچاس پھیرے مسجد کے کرتا۔

ماموں رمضان کے دوران کئی بار اس سے کہتے "ابے فخرو، تیرے روزوں سے فائدہ ہی کیا ہے، تو بیکار فاقے کرے ہے، بغیر نماز کے کہیں روزے ہوئے ہیں؟"

"اجی بالشر صاحب آپ نے جو وہ کتاب پڑھائی تھی، اجی وہی مولی زبان علی صاحب کی لکھی دی دینیات کی پہلی کتاب تو وس میں تو نماز الگ ورق پر لکھی ہے اور روزہ الگ ورق پر لکھا ہے، اور یوں تو اس میں کہیں نہ لکھا کہ روزہ بغیر نماز نہ ہو سکتا یا نماز بغیر روزہ نہ ہو سکتا۔"

اب اس صریحی منطق کا ماموں کے پاس کیا جواب تھا۔ وہ اسے دھتکارتے ہوئے کہتے "چل کمبخت دُور ہو، لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیوان ہی رہا۔"

دلچسپ بات یہ تھی کہ فخرو نے کبھی بیرسٹر ماموں سے انکار بھی نہیں کیا تھا کہ وہ نماز نہیں پڑھے گا پر کچھ ایسا ہو جاتا تھا کہ وہ صاف بچ نکلتا اور پھر بھی مزے میں رہتا۔

مثلاً مغرب کی نماز کے لیے ماموں مسجد جانے لگتے تو فخرو سے بھی کہتے۔

"ابے چل مسجد" مغرب کی اور صبح کی نماز وہ مسجد میں پڑھتے تھے۔ پہلے گھر میں اذان دیتے پھر مسجد میں جا کے نماز پڑھتے، فخرو گھر کے اس کمرے کی طرف اشارہ کرتا جہاں موکل بیٹھا کرتے تھے اور بڑی معصوم صورت بنا کے سرگوشی کرتا۔

"اجی بڑا موٹا موکل بیٹھا ہے گا بالسٹر صاب، جو میں تمہارے ساتھ چلا جاوں گا تو وہ مچھلی کی تنوں کھسل جاوے گا، تم پڑھ یاؤ نماز جتے میں اسے ذرا چٹ پٹی باتوں میں الجھاؤں ہوں، اور تم بھی ذرا جلدی ہی لوٹیو"

اب اس کے آگے ماموں کیا کہتے۔ جب وہ نماز سے واپس ہوتے تو فخرو کو موکل کے ساتھ گپ شپ کرتے پاتے۔ کبھی کبھی وہ صبح تڑکے فخرو کو پکارتے "ابے آ چلے بے مسجد، میں جا رہا ہوں"

وہ چائے کی ننھی سی پتیلی مانجتا ہوا صندلے پر بیٹھا بیٹھا ہی بڑے اطمینان سے جواب دیتا۔

"اجی تم چلو ——— وہ فاخری دادی کو رات لرزہ چڑھ گیا، ان کے لیے دو پتی چائے دم کر کے میں ابھی آوں فروٹ، تم چلو میر صاب"

فاخری دادی بڑی جلالی سیدانی تھیں، گھر کے ہر فرد کی بڑی اور بزرگ ۹۰ سے زیادہ توان کی عمر تھی لہٰذا ان کو سب کے حالات بھی معلوم تھے ——— ہر ایک کی ماں کا مہر اور اس مہر پر جو جھگڑا ہوا تھا، ہر ایک کے باپ چچا کی ڈالی ہوئی دھوبن یا تیلن، سب کی بدی کی عمدگی یاتی ——— ان کو غصہ چڑھتا تھا تو وہ سات پشت تُوم کے دھر دیتی تھیں۔ ظاہر ہے ان کی چائے میں کون اڑچن لگا کے اپنی سات پشتیں تُوماتا ——— ماموں بڑبڑاتے پیر پٹختے باہر چلے جاتے۔

یقیناً فخرو کے دل پر خدا نے گہری، کافی گہری مہر لگا دی تھی!

پھر ایک دن گھر میں کافی ہنگامہ ہوا ——— بات یہ ہوئی کہ فخرو کے پاس ایک جوڑا جوتا کہیں سے آ گیا، جوتا نہیں بوٹ۔ ایک دم عمدہ والا! چمچم کرتا، چاہو تو اس میں منہ دیکھ لو!

پھر اکیلا جوتا ہی نہیں تھا۔ ساتھ میں ایک ڈبیہ پالش اور برش بھی۔ سب بچے بیحد جوش میں آگئے تھے، کوئی ڈبیہ کو گول گول نچاتا، کوئی برش کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا، کوئی فیتہ کھینچتا ــــــ نوری آپا نے تو یہاں تک تجویز کی کہ اس جوتے کا کوئی نام رکھ دیا جائے، بیرسٹر ماموں بھی اس وقت بڑے عمدہ موڈ میں تھے۔ بولے، "ہاں ہاں، ضرور رکھو ــــ خدا بخش رکھو اس جوتے کا نام"

سب تو ہنسنے لگے مگر فخرو بے حد سنجیدگی سے بولے، "ابی کے تو ٹھیک کہو ہو میر صاحب گے بخشا تو ہے خدا ہی نے ــــ میں نے اتی دعائیں مانگی تھیں کہ اللہ میاں تم نے سب کچھ دیا بس اب بوٹ جوتا اور دلوا دو کہیں سے ــــ سو میر صاحب وہ موکل آیا تھا نہ، اجی وہی جن نے اجھاری والی تمیزن کی لونڈیا بھگائی تھی اور تم نے وسے صاف چھڑوا لیا تھا تو وِن نے مجھ سے کیا کہ بھائی جب میں آؤں تھا تو تو میری بہت خاطری کرے تھا ــــ اب میں باعزت بری ہو کے گھر جا رہا ہوں تو بتا تو کیا لیوے گا۔ سو چٹکی بجاتے میں۔ چھپر پھاڑ کے اللہ میاں نے دلوا دیا گے بوٹ ــــ اچھا ہے نہ میر صاب!" اس نے بڑے پیار سے جوتے کو دیکھا۔

"ابے ہاں، بہت اچھا ہے۔" بیرسٹر ماموں بولے، "اب آج تو مسجد چل کر نماز شکرانہ ادا کر"

فخرو چپ ہو گیا۔ جھک کے اس نے جوتے اٹھائے، بڑی احتیاط سے ڈبے میں رکھے، برش جوتوں کی آڑ میں فٹ کیا، پھر ڈبیہ ایک کونے میں بٹھائی، ڈھکنا ڈھک کے اسے تسلی سے باندھا، ڈبہ بغل میں دبایا ــــ اور کھسک لیا۔

شام کو مغرب کے وقت بیرسٹر ماموں مسجد میں داخل ہو ہی رہے تھے کہ انھیں فخرو کا سایہ گلی میں نکڑ پر دکھائی دیا ــــ نئے جوتے پہنے، نئی قمیض کا دامن اڑاتا، نئے پاجامہ کے پائنچے پھٹکارتا، ایک دوست کے ہاتھ میں ہاتھ دیے وہ گلی میں مڑنے ہی والا تھا کہ بیرسٹر ماموں نے للکارا، "فخرو ــــ ابے او فخرو ــــ یہاں آ ــــ ابے آ یہاں۔"

فخرو پھنس چکا تھا ــــ اس کا دوست اور وہ دونوں آئے۔

"چل وضو کر۔" ماموں نے حکم دیا۔

فخرو کسمسا کے بولا۔ "اجی پان کھا رہا ہوں بالسٹر صاب، اور پھر گے بھی تو بات ہے کہ...."

"گہ پان گے اس کو سسرال والوں نے کھلایا ہے، تھوک نہ سکے ہے بیچارہ۔"

اس کے دوست نے ٹکڑا جوڑا۔

ماموں ہنسنے لگے: "سسرال ؟ ابے چیکے ہی چیکے یہ سسرال کیسی ؟"

فخرو تو چپ رہا پر اس کا دوست بولا، "اجی کوئی ایسی ویسی بات نہ ہے، اشراف ہیں گے وہ لوگ بھی، اپنی برادری ہے بالسٹر صاب، لڑکی بھی قبول صورت ہے گی، نماز پڑھے ہے، کلام پاک ختم کر چکی ہے، ہم لوگوں نے سوچا کہ بیوی کے مرنے سے اس دکھیا کا گھر بھی اجڑ گیا ہے سو بس جاوے گا۔"

"اچھا اچھا —— وہ دیکھا جاوے گا، پہلے تم دونوں آدمی چلو، وضو کرو —— چلو۔"

ماموں نے اصل بات پر پھر زور دیا۔

فخرو نے بے بسی سے دوست کو دیکھا، دوست نے اُسے دونوں نے باری باری سے مٹی کا بدھنا اٹھایا، وضو کیا۔ مغرب کی نماز کے بعد مولی صاب روز وعظ کہتے تھے، آج بھی کہا۔ فخرو اور اس کے دوست نے کئی بار پہلو بدلا پر بیرسٹر ماموں نے ان کو گھورا کہ وہ پھر دبک کے بیٹھ گئے۔

آخر کار وعظ ختم ہوا اور پھر فخرو کو ایک ہی پل بعد معلوم ہو گیا کہ اس کا نیا بوٹ جوتا غائب ہے! سب لوگوں میں ہراسانی پھیل گئی۔ بیرسٹر ماموں بھونچکا رہ گئے۔ ان پر ایک منٹ تو بالکل سناٹا طاری رہا پھر فخرو کو سمجھاتے ہوئے بولے۔

"چل جانے دے —— ہو گا —— میں ابھی تجھے دوسرا لے دوں گا، ویں سے بھی اچھا —— سمجھ لے جس اللہ نے دیا تھا وسی نے لے لیا۔"

فخرو پر اب تک تو سکتہ طاری تھا مگر یہ بات سن کر وہ بپھر گیا۔ بھنّا کے بولا، "اجی گئے تو میں کبھی نہ ماننے کا ہوں کہ اللہ نے میرا بوٹ جوتا لیا —— اُن نے مجھے اتی دعائیں مانگنے پر دیا تھا، پھر وہ کے کیوں لیوے گا خوامخواہ اللہ کو بیچ میں گھسیٹو ہو بالسٹر صاحب —— لیا تو ہے کسی نمازی نے۔"

اب بیرسٹر ماموں کیا کہتے، وہ تو صاف ہی ظاہر تھا کہ کسی نمازی نے لیا ہے!

کھسیا کے بولے، "نہ جانے کون تھا شیطان کی اولاد۔ لوجی مسجد میں نماز کے بہانے آویں ہیں بھلے آدمیوں کے جوتے چرانے —— ابھی پولیس میں رپورٹ کر کے بند کرواؤں ہوں۔"

پولیس میں رپورٹ ہوئی بیرسٹر ماموں نے انعام کا اعلان کیا، دوسرے دن وعظ میں بڑے مولی صاحب نے بھی خوب لعنت ملامت کی۔ محلے میں بھی ایک ایک سے کہا گیا سنا گیا ــــــ پر بوٹ کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔

چوتھے یا پانچویں دن ایک اور واقعہ ہوا، مغرب کی نماز کے وقت فخرو مسجد میں پہنچا اور جیسے ہی مولی صاحب وعظ کہنے بڑھے وہ بڑے ادب سے بولا "اجی مولی صاجب، ائے کر میں کچھ کہنا چاہوں ہوں "

مولی صاحب کو اس سے بیحد ہمدردی تھی، فوراً ایک طرف کو ہوتے ہوئے بولے،

"ہاں بھائی ہاں، کہو کہو "

فخرو لوگوں کو مخاطب کر کے بولا، "بھلے آدمیو، نرسوں یہاں سے میرا نیا بوٹ چوری ہوگیا، نمازیوں کے سوا تو کوئی یہاں آتا نہ ہے سو کسی نمازی نے ہی لیا ہووے گا۔ خیر، پر میں نے سوچا کہ جس مسجد میں جوتا گیا، سو ہوئیں گے پالش کی ڈبیہ اور برش بھی چلا جاوے سو وہ میں لیتا آیا ہوں اور آپ نمازیوں کو بخشے دوں ہوں، اللہ سے دعا مانگوں گا کہ ایک بار دیا تھا سو دوسری بار بھی دیوے اور وس کی کریمی سے کچھ دور نہ ہے، دیوے گا اور پھر دیوے گا، ضرور دیوے گا "

اس تقریر کے بعد اس نے اپنے کرتے کی ایک جیب سے پالش کی ڈبیہ اور دوسری جیب سے برش نکالا اور مسجد کے ایک کونے میں اُچھال دیا۔ پھر اپنی پرانی سلیپریں پہنیں اور روانہ ہوگیا۔

جب میں چھوٹی سی تھی تو فخرو کافی بوڑھے ہو چکے تھے، ڈیوڑھی میں پلنگ پر بیٹھے کھانسا کرتے تھے۔ مگر ہر بار جب ہم لوگ ننھیال جاتے تو یہ قصہ ضرور سنتے۔ فخرو دادا سے کبھی پوچھو تو نماز کے ذکر پر تو وہ چپ رہتے پر اگر کوئی کہہ دیتا کہ جی اللہ کا کرنا یونہی تھا، تب وہ بہت بگڑتے "واہ جی، اچھی کہو ہو اللہ کا کرنا تھا ــــ اجی وہ تو دیوے ہے، وسے کے کیا کرنا ہے، نے تو ہے انسان، چھینے تو ہے بندہ ــــ اور نمازی بندے کی تو جب نیت بدلے ہے تو ایسی بدلے ہے ائے کہ جس کی کچھ ٹھیک نہ ہے سمجھے ہے نہ کہ نماز پڑھوں ہوں تو سات خون مجھ کو معاف ہو جاویں گے، جانے ہے کہ اللہ کچھ کہنے کو نے سے رہا، وہ گواہی دینے سے رہا، بس اپنی ساری کی کرائی، اگلی پچھلی گوڑی سمیٹی اور اللہ کے سر تھوپ دی۔ کیا انصاف ہے جی ــــ واہ "

قمر جمالی

یہ بات نہیں کہ سکینہ نے باپ کی شکل بھی نہ دیکھی ہو کیونکہ جب باپ کو اس نے دیکھا وہ اس کی اپنی اولاد کی طرح بے بس تھا، ایک ایسے تناور درخت کی طرح جیسا مدر سے دیمک چاٹ گئی ہو، جس کی جڑیں زمین چھوڑ چکی ہوں۔ اور جسے آبِ حیات مہیا کرنے والے پتّے تو کجا ٹہنیاں بھی چٹخ چٹخ کر نیچے گر گئی ہوں بے جا ضد اور لاڈ پیار کو اس نے کبھی اپنا حق نہیں جانا بلکہ کسی بھی ضرورت کے اظہار سے قبل اس نے سینکڑوں مرتبہ اسے رد کر کے دیکھا کہ وہ ضرورت دب ہی جائے تو بہتر ہے۔ مبادا کہ اس کے اظہار سے اس کے باپ کا اپنی بے بسی کا احساس اور بڑھ جائے گا۔ یہ تھا سکینہ کا بچپن۔

جوانی؛ جس کے تذکرے ہی سے لڑکیوں کے رخسار پر حیا کی سرخی ان کے سراپا کو شفق گوں بنا دیتی ہے، ایسے کسی احساس کو سکینہ نے اپنے اندر اُتھل پتھل ہونے محسوس نہیں کیا۔ الٹا اسے تو ہمیشہ یہی دھڑکا لگا رہا کہ ــــ آسمان کا ٹکڑا نہ جانے کب ٹوٹ کر اس کی ماں کے سر پر گر پڑے جو ایک چینی مرغی کی طرح اپنے تینوں بچوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپائے، اپنی پھیلی ہوئی آنکھوں سے آسمان کو تاکے۔۔ مسلسل فریاد کر رہی ہے "الٰہی! آندھیوں کے بادبانوں کی طنابیں کھینچے رکھو۔۔ ورنہ یہ پیڑ ذرا سے جھکڑ سے زمیں بوس ہو جائے گا۔"

اندیشوں سے ہونی ٹل تو نہیں جاتی۔ سچ تو یہ ہے کہ اندیشے درحقیقت آگے درپیش حادثوں کے اشارے ہوتے ہیں جنھیں ہمارا مافی الضمیر ہم سے پہلے محسوس کر لیتا ہے۔ کاش سکینہ کا مافی الضمیر اس کی قسمت کی طرح خوابیدہ ہوتا ——! کم از کم وہ اس قبل از مرگ واویلا والی اذیت سے تو بچی رہتی۔ آگے درپیش موت کو لمحہ لمحہ محسوس تو نہ کرتی۔ مگر نہیں۔ اس کا مافی الضمیر اس کی قسمت کی طرح سرکش تھا۔ بات بات پر کسی انجانے خطرے کا اشارہ دے دیتا، تو کسی زخمِ نادیدہ کو وہ اپنے دل کے اندر رِستا محسوس کرتی۔ لہو کی دھار دل سے نکل کر آنکھوں سے ٹپک جانے کو تیار ہوتی تو وہ اپنے جبڑے مضبوطی سے جکڑ لیتی اور۔۔غم کی امڈتی باڑھ کو گھونٹ در گھونٹ اندر ہی اندر پی جاتی۔ کتنی بار اس نے سجدہ ریز ہو کے خدا کے حضور گڑگڑایا تھا کہ ان خدشوں اور وسوسوں کی تعبیر اس کے خوابوں کی تعبیر کی طرح الٹی ثابت ہو —— مگر۔ ۔ مشیّتِ ایزدی بدلتی کہاں ہے ——! ساری دعائیں اکارت گئیں۔ اندیشوں نے جیسا نقشہ کھینچا، ہو بہو وہی تصویر نکل آئی۔ وہی پیپل کا کھوکھلا تنا۔ وہی سفید لٹھے کی کفنی —— وہی دہشت زدہ زمین سے چپکی ہوئی جینی مرغی —— اور۔ ۔ وہی تین ننھے چوزوں کی چاؤں ۔ ۔ ۔ ۔چاؤں

بیس سال گزر گئے اس واقعے کو مگر آج بھی سکینہ کو گزرے کل کی طرح یاد ہے۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا، طوفانِ باد و باراں تھا۔ لوگ اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے کہ آندھی کے پہلے ہی جھکڑ پہ وہ تنا اور کھوکھلا تنا ڈھے گیا۔ مگر۔ ۔ ۔ اس دن ہمیشہ کی طرح اندیشوں سے پژمردہ، کسمسا کر وہ ماں کے پروں میں سمٹ نہیں گئی، بلکہ۔ ۔ پھڑک کر باہر نکل آئی —— اور درخت کے زمیں بوس ہونے سے قبل ہی جھپٹ کر اپنی ماں کو، اس کے پروں کے نیچے دبکے، سہمے دو ننھے چوزوں سمیت، سمیٹ کر باہر نکالا۔ اور خود —— ؟ آنِ واحد میں جوان ہو گئی۔ شتر مرغ سی بلند قامت۔

اس دن سکینہ روئی نہیں۔ ہاں زندگی بہت تلملائی تھی۔ بڑی بے بسی تھی زندگی کی آنکھوں میں اس دن۔ بلبلاتی۔ ۔ فریاد کے لئے اٹھتے ہوئے زندگی کے اُن بے جان ہاتھوں کو اس نے گرنے سے قبل ہی تھام لیا۔ اپنے سینے پر پڑے ڈوپٹے سے اس نے ماں کے سر پر ردا کھینچی۔۔ بہنوں پر سائبان کیا۔ اور خود ایک چھتنار درخت بن گئی۔

اب سکینہ کس سے ڈرتی ——! خود اس کی آنکھیں اتنی پُر جلال تھیں کہ زندگی با جوہر گھڑی

نیا سوانگ رچاکر اسے ڈرایا کرتی ــ اب عافیت کے لئے پناہ مانگنے لگی۔

مگر۔ زندگی کا کبھی جواب نہیں ــ ! جہاں اس نے محسوس کیا کہ سکینہ کے آگے وہ بے زبان ہو گئی ہے، اس نے اپنی چال ہی بدل ڈالی۔ پتہ ہی نہ چلا کہ کب وہ دبے پاؤں اس کی ماں سے جا ملی۔! ہمیشہ چپ چپ رہنے والی ماں کے جسم میں بلا کی ہلچل آ گئی۔

"پڑوسن آئی تھیں۔ شام پھر آئیں گی۔ ذرا منہ ہاتھ دھو کر ڈھنگ کے کپڑے پہن لے" دفتر سے گھر آتے ہی اماں حکم صادر کرتیں تو سکینہ کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ ہمیشہ چپ رہنے والی اماں کو یہ آخر ہو کیا گیا تھا ــ ! وہ گھنٹوں سوچا کرتی۔

"میری سہیلی کا لڑکا آیا ہے ایران سے۔ لڑکا دیکھا بھالا ہے۔ مجھے تیرے 'ہاں' 'نا' کی ضرورت بھی نہیں" اماں کیسے پٹر پٹر بولنے لگی تھیں۔ اس کی عقل دنگ تھی۔ کسی نہ کسی طرح وہ ہر دن پیش آنے والی 'بلا' کو ٹالتی رہی۔ مگر ایسا کرتے کرتے گھر کی فضا ربگڑ گئی۔ جن کی سانسوں کے زیر و بم تک دیواروں نے نہیں سنے، اب ان کے چرچے دیواروں سے پرے تذکروں میں ہونے لگے۔ اماں کو مظلوم اور بیٹی کو زباں دراز گردانا جانے لگا۔ سکینہ یہ سب چپ چاپ سہتی رہی۔ کبھی کبھی وہ ماں کو ٹٹولتی کہ آیا اس ضد کے پیچھے چھپے جذبے کو اماں سمجھتی بھی ہیں کہ نہیں۔

"اماں ــ ! یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ ہزار سمجھانے پر بھی میں شادی نہیں کروں گی، آپ اپنے اوپر اتنا بار کیوں لیتی ہیں ــ ! ناحق بیمار ہو جاتی ہیں۔ میری اس مہم میں آپ بھی میری ساجھے دار کیوں نہیں بن جاتیں ــ ! پھر دیکھئے یہ دکھ، درد، مایوسی ان سب کا گلا میں کیسے گھونٹتی ہوں ــ !"

"کن کن کا گلا گھونٹے گی ــ ؟ پڑوسیوں کا ؟ محلے والوں کا ؟ تیرا کیا ہے۔ ! صبح اٹھی تو دفتر، شام ہوئی تو لائبریری۔ مگر میں ــ ؟ لوگ طعنے کسنے لگے ہیں کہ میں بیٹی کی کمائی پر راج کرتی ہوں۔ نہیں چاہتی کہ بیٹی کی گھر گرہستی ہو۔ اب تو لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھانے لگے ہیں۔"

"کون ہیں وہ ــ ؟ کون کہتا ہے ایسا۔ آپ پر اٹھی انگلی کو میں قلم کر دوں گی۔"

"داداگری کرے گی۔ واہ رے نصیب ــ !" الٹا سمجھنے کی بجائے اماں اتنا روتیں کہ صحت مزید بگڑنے لگتی۔

آخر ایک دن سکینہ اماں سے ہار گئی۔ سرخ لباس میں گٹھڑی بنی وہ کسی کے دامن

میں جھونک دی گئی۔ ہاں ___ اس دن سکینہ بہت تلملائی، بہت روئی۔ اور اپنے کندھوں پر اپنا جنازہ اٹھائے ایک اور دنیا میں منتقل ہو گئی۔

یہاں کی دنیا سکینہ کے لئے بالکل انوکھی تھی۔ کیونکہ اس گھر کے لوگ سکوں کی تال پر کٹ پتلی کی چال کو سمجھتے تھے۔ جذبات کی زبان ان کے لئے کوئی غیر ارضی شئے تھی۔ کوئی زر پرست، تو کوئی طلب پرست۔ کہاں وہ جہاں کہ جہاں جان کی بازی لگانے میں مسابقتی دوڑ دوڑی جاتی اور کہاں یہ کہ کوئی جان سے جا رہا ہو تو، کوئی یہ کہہ کے گزر جاتا کہ یہی مناسب وقت ہے اس کے جان چھوڑنے کا۔

اس گھر میں سب سے عجیب شئے اسے اپنی ساس لگی جو کہنے کو تو گوشت پوست کی بنی تھیں۔ مگر ایک دم پتھر کا بت۔ انسان کو تو کیا سمجھتیں خدا سے بھی ان کی شناسائی نہ تھی۔ پڑھی لکھی اتنی کہ پیٹ تو کیا نس نس کھول کر دیکھ لو کہیں الف نہیں۔ محبت انھیں صرف اپنے آپ سے تھی۔ جب تک خود اپنے جسم پر مار کی اذیت محسوس نہ کرتیں، آنسو کی کیا مجال جو ان کی آنکھوں میں آتے ___! اور دل ___؟ پتہ نہیں ان کے سینے میں دل تھا کہ نہیں ___! اگر ہوتا تو کبھی تو اس کے تڑپنے کی آواز سکینہ نے سنی ہوتی۔ حالانکہ اس درمیان ایسے کئی مواقع آئے بھی۔

بہت جلد سکینہ کو محسوس ہونے لگا کہ اسکو مات ہو گئی ہے۔ اب مہرے سمیٹ لینے چاہئیں۔ دن بھر وہ سوچا کرتی کہ ان پتھر کے بتوں کے بیچ وہ لہولہان ہو جائے گی۔ مگر رات جب طیب گھر آتا تو وہ اسے نرم و گرم گوشت پوست کا انسان لگتا۔ اس کے ہاتھوں کو وہ اپنے ہاتھوں میں لئے الٹ پلٹ کر دیکھتی کہ ان میں خون کی رگیں ہیں ___؟ شہ رگ پر کان رکھ کر سنتی کہ سانسوں میں اللہ ہو کا ورد جاری ہے ___؟؟ سینے پر سر رکھ کر محسوس کرتی کہ جذبات کے زیر و بم سے دل کروٹ لیتا بھی ہے ___!

ہر دن وہ بساط الٹنے کا فیصلہ کرتی اور رات کو بھول جاتی۔ پانچ سال گزر گئے۔ اسے پتا ہی نہ چلا۔ اس بیچ وہ خود تین لڑکیوں کی ماں بن گئی۔ اپنے ننھے منے ناتوان چوزوں کی نگہداشت کرتے ہوئے وہ سب کچھ بھول گئی۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ فاختہ اور شتر مرغ، چینی مرغی کیسے بن جاتا ہے۔ اب تو وہ یہ بھی بھول گئی کہ پتھروں سے چلتے چلتے اس کے پہلو کس قدر لہولہان ہو گئے ہیں۔ یا یہ کہ ان زخموں پر کھرنڈ کی جگہ بے حس خول چڑھ گیا ہے ___ کہ نہ اب ان میں درد ہوتا ہے اور نہ دل کے کروٹ بدلنے کی آواز ہی آتی ہے۔ اور تو اور۔۔۔ وہ اپنی دو چھوٹی بہنوں کی شادی کے

لئے اماں کے ساتھ زندگی کی مسابقتی دوڑ میں شامل ہو گئی۔ اب اسے اماں کی باتیں بری نہیں لگتی تھیں۔ اپنی جگہ اپنی بہنوں کو کھڑا دیکھ کر وہ تلملا اٹھتی اور اسی فکر میں لگی رہتی کہ کسی طرح ان دونوں کی شادی ہو جائے۔

پھر وہ دن بھی آیا کہ سکینہ نے کسی طرح اپنی دونوں بہنوں کی شادی کروادی۔ اس طرح دو گھر آباد تو ہو گئے، مگر۔۔۔ وہ گھر جسے اس نے اپنے خون پسینے سے بنایا تھا ویران ہو گیا۔

اب اماں اس قابل نہیں رہیں کہ اکیلی رہ سکتیں۔ ایک بار پھر بساط پر جما اس کا اسپ اپنی چال بھول گیا۔ سکینہ ایک بار پھر اسی گرداب میں پھنس گئی جس سے وہ بڑی مشکل سے آزاد ہوئی تھی ایک بار پھر وہ خود کو اسی تناور پیپل کے پیڑ تلے کھڑا محسوس کرنے لگی جس کا تنا اندر سے کھوکھلا ہو گیا تھا۔ جس کی جڑیں زمین چھوڑ چکی تھیں۔۔ اور جس کی ٹہنیاں چٹخ کر نیچے گرنے لگی تھیں۔ حد تو یہ کہ اس پیڑ کے نیچے دبکی سہمی کوئی چینی مرغی بھی نہ تھی، جو سر اٹھا کے فریاد کرتی ——"الٰہی اندھیوں کے یاد بانوں کی طنابیں کھینچے رکھ"

ادھر اماں مصر کہ وہ اس چار دیواری میں جان دے دیں گی مگر بیٹی کے گھر خود کو بے عزت کروانے نہیں آئیں گی —— اور ادھر اپنی گرہستی میں قید مردہ صندوق جیسی سکینہ جس میں خود اس کی اپنی لاش سڑ رہی تھی۔

"تم سمجھتی ہو تمہارے کھانا نہ کھانے سے تمہاری اماں کا پیٹ بھر جائے گا —؟ میں عاجز آ گیا ہوں اس زندگی سے۔ تم نے تو میری اچھی خاصی زندگی جہنم کر کے رکھ دی"

"طیّب، سکینہ کو قصوروار ٹھہراتا تو سکینہ کو اس پر غصہ آنے کی بجائے اپنے آپ پر غصہ آتا۔ طیّب ٹھیک ہی کہتا تھا۔ وہ ہزار چاہتی کہ اپنی نحوست اپنی ذات تک محدود رکھے، مگر ذرا جو آنکھیں نم ہوتیں تو بچے چیخ چیخ کر سب کو سنا دیتے۔ ذرا جو چپ ہوتی، تو آنکھیں چیر چیر کر محسوس کرتے کہ کہیں رونے سے قبل والا عالم تو نہیں۔ کھانا نہیں کھاتی تو ڈھنڈورا پیٹا جاتا۔ وہ بھی عاجز آ گئی تھی اس زندگی سے۔

"آخر تم چاہتی کیا ہو —؟ نہ تم چین کی زندگی جیتی ہو نہ مجھے جینے دیتی ہو۔ کھانا کھاؤ تو، اماں کھائی بھی ہوں گی کہ نہیں، باہر جاؤ تو، اماں اکیلی کتنی تڑپ رہی ہوں گی ——! کبھی کبھی تو جی کرتا ہے، اس بڑھیا کو۔۔۔۔"

"موت اکیلے انھیں نہیں آئے گی۔ اماں کے ساتھ میرا بھی جنازہ اٹھے گا"

سکینہ ہزار چاہتی مگر اب ضبط پر اُس کا اختیار باقی نہ رہا تھا۔ جو حال برسوں پہلے اس کے اپنے گھر کا ہوا تھا، اب آہستہ آہستہ وہی حال یہاں کا ہونے لگا تھا۔ خوف، ہراس، یاس، ناامیدی، احتمال اور خدشات۔۔ ان سب کے تابڑ توڑ حملوں سے سکینہ جو کبھی ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ تھی۔۔۔ اب کھنڈر بن گئی تھی ـــ کہ ذراسی آواز سے گونج پیدا ہو جاتی، اور گرہستی کے در و بام مرتعش ہو جاتے۔ یہی تو وہ نہیں چاہتی تھی۔

آخر طیّب ہی نے یہ معرکہ بھی سر کیا۔ بہت سمجھا منا کر جھوٹ سچ کہہ کر عارضی طور پر ہی سہی اماں کو ان کے ساز و سامان کے ساتھ اپنے گھر منتقل کر لیا۔

اماں کی آمد سے ایک بار پھر سکینہ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پچکے گال بھرنے لگے، آنکھوں میں زندگی نمودار ہونے لگی۔ سکینہ میں اس تبدیلی کو محسوس کر کے طیّب نہال ہو گیا۔ بچے چہکنے لگے، گھر کے در و دیوار گنگنانے لگے۔ مگر۔۔۔ سکینہ کی یہ تبدیلی گھر کے ایک فرد کو بُری طرح کھلنے لگی۔ وہ تھیں ـــ سکینہ کی ساس۔

"تیری جورو نے اس گھر کو دھرم شالہ سمجھ لیا ہے کیا ـــ ؟"

"امی آہستہ بولو۔ وہ سن لیں گی۔ بڑی خوددار خاتون ہیں۔"

"ہاں تبھی تو داماد کی روٹیاں توڑنے چلی آئیں۔"

"امی! کیا غضب کرتی ہیں۔ کھڑے پاؤں لوٹ جائیں گی۔"

"میری بلا سے۔ میں کیا ڈرتی ہوں ـــ ہ توبہ! توبہ! کیا زمانہ آ گیا ہے۔ ہمارے زمانے میں لوگ خودکشی کر لینا پسند کرتے تھے مگر بیٹی کے گھر رہنا نہیں۔"

"امی بڑا بول نہ بولو۔ خدا کو برا لگے گا۔ وہ بڑی نیک خاتون ہیں۔"

"ہاں ہاں۔ تبھی تو بیٹی کی کوکھ سے ایک بھی تناور درخت پیدا نہ کر سکیں۔ چھوٹی موٹی سی بیلیں اگا دیں ـــ اور کسی نہ کسی کے منڈوے چڑھا دیا۔"

ماں، بیٹے کے جھگڑے بس کچھ ہی دن دونوں کے بیچ رہ سکے۔ پھر تو بات اتنی طول پکڑ گئی کہ اماں بھی بچی نہ رہ سکیں۔ جب کبھی سکینہ کی ساس کا غصہ نہ سنبھلتا اور وہ طیّب کو ہموار کرنے میں ناکام ہو جاتیں، تو دندناتی ہوئی اماں کے کمرے میں سے گزر کر بالکنی میں نکل جاتیں اور جاتے جاتے اماں کی طرف رخ کر کے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتیں، اور دونوں گال زور زور سے پیٹتیں جیسے انھوں نے اماں کو کسی غیر شریفانہ کام میں ملوث دیکھ لیا ہو۔ اماں، سکینہ کی

ساس کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھتیں تو مارے خوف کے تسبیح کے دانے زور زور سے گھمانے لگتیں۔ سکینہ کی ساس کا غصہ پھر بھی قابو میں نہ آتا تو وہ بڑی بڑی آوازیں نکال کر بچوں کو پکارتیں۔

"توبہ! کیا زمانہ آگیا ہے۔ اب تو یہ دو دو انچ کی چھوکریاں بھی مجھے نظر انداز کرنے لگیں"

پھر یہاں وہاں کی ہانکنے لگتیں۔

"اتنا اونچا کیوں بولتی ہو سمدھن۔ اختلاج ہوتا ہے" اماں دل کی مریضہ تھیں۔ سکینہ کی ساس کی آواز تو ایسی تھی کہ شیطان بھی گھر چھوڑ کر بھاگ جاتا۔ پھر اماں تو دل کی مریضہ تھیں۔ جب جب سکینہ کی ساس پکارنے پر اتر آتیں، اماں پسینہ پسینہ ہو جاتیں۔ کبھی کبھی تو نہ چاہتے ہوئے بھی بے اختیار ٹوک دیتیں۔

"آہستہ بولو نا سمدھن۔ ہاتھ پیر کانپنے لگے ہیں"

"آہستہ بولوں ــــ؟ میں ــــ؟ میں آہستہ بولوں ــــ؟ کسی کی ماتحت ہوں کیا؟ میرا گھر ہے ــــ میں مالکن ہوں۔ بیٹا جنا ہے۔ سمجھیں؟"

اماں کو لگتا کہ خواہ مخواہ ہی شہد کے چھتے پر کنکری ماری۔ حیرت سے ان کی آنکھیں پھیل جاتیں جیسے کہہ رہی ہوں ــــ "مجھے کیا پتا تھا سمدھن! کہ بیٹا جننا اتنا ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ جہاں تین درد سہے ــــ ایک درد اور سہہ لیتی ــــ" پھر جو داماد کو سامنے کھڑا پاتیں تو مارے شرم کے گڑ جاتیں۔ آخر سکینہ ہی بہلا کر انھیں دوبارہ حواس میں واپس لے آتی۔ اماں مارے گھبراہٹ کے پان دان کھول کر پان کی بجائے دو چار چٹکی زردہ پھنک لیتیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے ان کا بلڈ پریشر بڑھ جاتا۔ الٹیاں ہونے لگتیں ــــ طیب دوڑ کر ڈاکٹر بلا لاتا۔ بلڈ پریشر چیک (CHECK) ہوتا اور اماں کو نیند کی گولیاں کھلا کر سلایا جاتا۔ تب کہیں جا کر کہ وکے بستر میں شعلیں جلنے لگتیں۔

اماں کے آنے کے بعد کچھ دن تو سکینہ دفتر سے چھٹی لے کر گھر ہی پر رہی۔ مگر پندرہ بیس دن بعد وہ دوبارہ دفتر جانے لگی۔

ایک شام وہ گھر لوٹی اور مکان میں بہت سے لوگوں کو آتا جاتا دیکھا تو سکینہ اپنے فلیٹ کی چودہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چودہ بار مر مر کے زندہ ہوئی۔ اندر آئی تو دیکھا کہ اماں بستر پر پڑی کراہ رہی تھیں۔ سکینہ کو دیکھا تو چیخ چیخ کر رونے لگیں۔ بچے رو رو کر ہلکان ہو رہے تھے۔ بابا! اماں چپ... میں گر پڑیں داہنا پاؤں جو ذرا سے فالج زدہ تھا

بیت الخلا رکا موری میں پھنس گیا تھا۔ باہر نکالتے ہوئے ٹخنے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ بہت دیر تک اماں اور سکینہ دونوں روتے رہے۔ کبھی قسمت پر تو کبھی قدرت کی مہربانیوں پر۔

ڈاکٹروں کی امید کے خلاف پیر کی ہڈی یوں جڑ گئی جیسے کبھی ٹوٹی ہی نہ ہو۔ مگر مسلسل چار ماہ تک پلستر میں رہنے کی وجہ سے پیر میں چلنے پھرنے کی طاقت سلب ہو گئی۔ سکینہ روز پاؤں کی مالش اور ورزش کرواتی، اور دفتر جاتے ہوئے بستر کے بازو ضرورت کی ہر چیز رکھ جاتی۔

اماں کی خلافِ توقع سدھرتی حالت دیکھ کر سکینہ کی ساس کے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ وہ ہر وقت بہانے تلاش کرتیں کہ کس طرح ان کی سدھرتی حالت کو دوسرا رخ دیا جائے۔ کبھی کبھی اماں کو سوتا دیکھ کر وہ انتقاگاان کے سرہانے سے دوپہر کے کھانے کا (CASSEROLE) اور پانی کی صراحی اٹھا لیتیں ـــــ اور سکینہ کے گھر آنے سے قبل واپس رکھ دیتیں ـــ

اس دن اماں صبح ہی سے بے حال تھیں۔ سکینہ نے آفس جانے سے قبل ہی انھیں نیند کی دوا دے دی تھی۔ دو چار گھنٹوں بعد اماں کی آنکھ کھلی اور پانی کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھوں نے چھوٹی نواسی کو آواز دی۔

"ارے ـــ یہ آپ پانی کیوں لانے لگیں سمدھن ـــ" سکینہ کی ساس کو پانی کا گلاس لئے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ جھکمانے لگیں۔

"تمھیں جو بھی ضرورت ہو مجھ سے کہہ دیا کرو ـــ میں پوری کر دوں گی۔ بچوں کو آواز نہ دو"

"کیوں بھلا۔؟"

"انھیں غیروں کی خدمت کرنے کی عادت نہیں ہے"

"مگر۔ ۔ ۔ ۔ میں تو کوئی غیر نہیں" اماں تلملا اٹھیں۔

"یہی تو مجبوری ہے۔ تمھیں 'اپنے' اور 'پرائے' میں فرق کرنے کی تمیز ہی نہیں ہے"

شام سکینہ گھر لوٹی تو اماں کو دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا۔ مگر ہزار پوچھنے پر بھی انھوں نے بتایا نہیں۔ ہاں چھوٹی لڑکی نے سارا ماجرہ دہرا دیا۔

اس رات دونوں ہی سو نہ سکے۔ سکینہ اپنے کمرے میں روتی رہی اور اماں اپنے کمرے میں۔ کتنی بے بس ہو گئی تھی وہ ـــ! کہاں وہ شیر جیسا سینہ، اور کہاں یہ چوروں کی طرح منھ چھپا چھپا کے رونا ـــ! کیا وہ اتنا بھی نہیں کر سکتی تھی کہ یہ گھر گرہستی تیاگ دیتی ـــ اماں کے لئے جنھوں نے اپنی جان کی پروانہ کر کے ٹوٹتے آسمان تلے اپنے پروں میں چھپا کے اسے اڑنے کے

۱۔ کھانا رکھنے کی بند ڈھکن والی ڈش

قابل بنایا —!

شاید نہیں — مگر کیوں؟؟

ساری رات وہ اپنے آپ سے یہی سوال دہراتی رہی۔

نہیں کیوں —؟ آخر کیوں —؟؟ —

"یہی تو تسلسلِ حیات ہے" کوئی اس کے اندر سے مطمئن کرنے کی کوشش کرتا رہا۔" ہاں —

جینے جی مرنا، اور مر مر کے جینے کے یہ سلسلے بقائے حیات کے اجزائے ترکیبی ہیں، جو ازل تا بہ ابد قائم رہیں گے۔ اگر یہ تسلسل ٹوٹ جائے تو حیاتِ آدم کی کڑیاں جگہ جگہ سے بے مکاں ہو جائیں گی۔ حیات کی اِن کڑیوں، کو ان کے مکانوں میں جمائے رکھنے کے لیئے — ہونی ان ہونی، حق ناحق جائز ناجائز — کا یہ پہیہ گھومتا ہی رہے گا۔ تبھی تو اس کی گردش کے پسِ پردہ دھوپ چھاؤں کی تمیز ہی انسان کو اور مخلوقات پر فوقیت عطا کرتی ہے یہی مسلسل حیات ہے — اور یہی زندگی بنتی، حوا، ہابیل و قابیل کو الجھتا دیکھ کر جب بھی مجبور تھی اور — اب بھی۔ یہ سلسلہ دائمی ہے۔ نہ اماں نے اپنی اماں کے لیئے اپنی گرہستی برباد کی، اور نہ تم کر سکو گی" یہ سکینہ کا وہی نامہجار دوست تھا۔ اس کا مافی الضمیر جس سے پیچھا چھڑانا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔

دوسری صبح وہ اٹھی تو، اماں کو حسبِ معمول درود وظیفہ میں مشغول دیکھ کر اُسے اطمینان ہوا اور وہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

"اماں! ادھر آ" انھوں نے آواز دے کر سکینہ کو پاس بلایا۔

"یہ میرے کپڑے ہیں۔ یہاں سرمہ اور عطر رکھا ہے — اور یہ۔ کچھ پیسے ہیں" اپنی الماری کھول کر وہ ایک ایک چیز سکینہ کو بتانے لگیں۔

"مگر۔ یہ سب کیوں —؟"

"پتا نہیں کب آنا ہو۔ مشیتِ ایزدی ہوگی تو انکار کیسا۔ مگر دعا ہے کہ اب اس گھر کی سیڑھیاں نہ چڑھوں" اتنا کہہ کر اماں سکینہ سے لپٹ گئیں۔ دونوں پتا نہیں کب تک روتے رہے۔ پاس کھڑے بچے بھی اس صفِ ماتم میں شامل ہو گئے۔ گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ سکینہ کو اس وقت ہوش آیا جب طیب اسے ڈانٹنے لگا۔

"اب یہ تماشا یہاں دوبارہ نہیں ہوگا بیٹے۔ میں جا رہی ہوں" اماں نے اعلان کیا تو طیب بھی سرد پڑ گیا۔

"میں ثمینہ کے ہاں جارہی ہوں۔ اور اس امید پر کہ دوبارہ اپنی مرضی سے نہ آؤں۔"
اماں اپنی سانس برابر کرتی ہوئی کہنے لگیں تو سکینہ کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ فلیٹ میں رہنے کا اپنا ایک سلیقہ ہوتا ہے ـــــ ایک تہذیب ہوتی ہے فلیٹس میں رہنے والے بھلے ہی کبھی کسی خوشی کا برملا اظہار کرتے ہوں ـــــ مگر غموں کی دولت کو تو یوں چھپا کے رکھتے ہیں جیسے یہی ان کی زندگی بھر کی کمائی ہے۔
"اماں! ثمینہ کے ہاں آپ کا رہنا درست نہیں۔ اس کا شوہر بیرونِ ملک رہتا ہے۔ وہ خود اپنی ساس کے دباؤ میں رہتی ہے۔" طیب اماں کو سمجھانے لگا۔
"نہیں بیٹا! میں ثمینہ کے ہاں رہنے نہیں جارہی ہوں۔ اس کی لڑکی یاد آتی ہے۔"
اماں نے پھر کسی کو کچھ کہنے کی مہلت نہ دی۔ بازو رکھی بیساکھی سنبھالی اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں پاس ہی سکینہ کی ساس کھڑی دل ہی دل میں مسکرا رہی تھیں۔ اماں اچانک ایک فاتح سنپری کی طرح پلٹیں اور کہنے لگیں۔
"میں جارہی ہوں سمدھن! اب تم اپنوں کے بیچ خوش رہنا۔ تم نے مجھے غیر کہا۔ میں دراصل غیر نہیں مہاجر تھی۔ اپنے گھر سے ہجرت کر کے اس منزل پر دم لینے ٹھہر گئی تھی۔ تم شاید نہیں جانتیں مہاجر کبھی پیچھے کی طرف نہیں لوٹتا۔ یہ ہجرت کی تہذیب بھی ہے اور ... اس سیدانی کا وعدہ بھی۔ تم نے جو بھی میرے ساتھ کیا، اسے میں دہرا تو نہیں سکتی، ہاں مگر یومِ حساب سامنا ہو جائے یہ آرزو ضرور رہے گی۔"
پھر اماں تیز تیز قدموں سے کھٹ کھٹ کرتی کسی صحت مند انسان کی طرح سیڑھیاں اترنے لگیں۔ کیوں نہ ہو ـــــ اماں کو تو لمحوں میں سفر کرنے کی عادت تھی۔ سکینہ دم بخود یہ سب کچھ دیکھتی رہی، ایک پتھر کے بت کی طرح۔ دور ـــــ بہت دور تک۔ اماں کا وجود سمٹتا گیا۔ سمٹتا گیا ـــــ یہاں تک کہ وہ ایک نقطے میں تحلیل ہوگئیں۔ پھر ایک زور کی آندھی چلی۔ اب اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ ریت کے بگولے اور دھندلا آسمان ـــــ کیا اماں بھی بگولہ بن گئیں!! دل نے بیلیوں ساتھ چھوڑ دیا ـــــ جسمِ خاکی کے سارے عناصر تحلیل ہو گئے ـــــ حیات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔
ریت کے بگولوں نے اماں کو تو اپنی امان میں لے لیا ـــــ مگر سکینہ ـــــ!! سکینہ کی آنکھیں جو ... خون ہوگئیں۔ آنسو ذرا سے نہیں ـــــ رتیلی یادوں سے پتا ہی نہ چلا مسافر

کب ہجرت کر گیا ـــــــ اماں کی زندگی میں کب شام ڈھلی ـــ اور کب رات ہوئی ـــ یا پھر اماں نے شاید آنکھ ہی اس وقت کھولی ـــ جب زندگی کسی ویران سے اکیلے مکان کی خواب گاہ میں چھپر کھٹ پر اُکڑوں بیٹھے، کھڑکی کے پردے کے پیچھے سے ٹُکر ٹُکر آسمان کو دیکھ رہی تھی، اور سیاہی قریہ قریہ روشنی کو نگل رہی تھی بس ذرا پلک جھپکی کہ رات ہو گئی۔

سکینہ نے اپنے آپ کو ٹٹول کے دیکھا۔ وہ خود اسے کہیں نہ ملی ـــــ کہیں بھی نہیں ـــــ شاید ریت کا بگولہ بن گئی تھی ـــــ یا پھر ـــــ وہ سیاہ نقطہ جو بگولوں سے بنے سوالیہ نشان کے نیچے سمٹ آیا تھا۔!

۲ر ستمبر ۱۹۹۱ء

قمر جمالی

کفن

"اماں ٹھنڈ لگتی ہے"

ماں جی! . . . آپ پہلے پسند کرلیں، پھر قیمت دیکھیں گے۔" اپنے پانچ سالہ بچے کی بات نظرانداز کرتے ہوئے وہ جلدی جلدی مرتبانوں کا ڈھیر اُلٹ پلٹ کرنے لگی۔

"اماں بہت ٹھنڈ لگتی ہے" لڑکا بہت کپکپا رہا تھا۔

"ٹھہرنا بیٹا" . . . اُس نے کپکپاتے ہوئے لڑکے کو بازو سے پکڑ کر پرے دھکیلا اور مرتبانوں کے ڈھیر میں کھو گئی۔ یہ گوری تھی، گلے مَن، برتن اور مرتبان بیچنے والی خانہ بدوش عورت۔

پندرہ دن قبل اس نے یہاں پڑاؤ کیا تھا۔ بدنصیبی یوں بھی آنکھیں نکالے اس کا تعاقب کر رہی تھی مگر اس بار اُس نے وہ گھن گرج کیا کہ فضا میں رخنے پڑ گئے اور مسلسل پانچ دن تک آسمان رِستا رہا۔ عام زندگی معطل ہوگئی۔ لوگوں نے پانچ دن قبل جو کواڑ بند کیے تو وہ مسلسل بند رہے اور کسی نے باہر جھانکنے کی ہمت تک نہ کی۔ زمین کیچڑ سے لت پت ہوگئی۔ مطلع ابھی صاف نہیں ہوا تھا۔ ہوا کا جھکڑ چلتا تو ٹھنڈ کے نکیلے دانت ہڈیوں میں پیوست ہو جاتے۔ ہاں مگر منجمد خون کی دھار یخ بستہ زخموں سے بہنے کی بجائے آنکھوں سے ٹپک پڑتی۔

گوری بھی گوشت پوست کی بنی تھی، سردی اُسے بھی ہو رہی تھی مگر اسے اپنا ہوش کہاں تھا . . . ! وہ تو فکرمند تھی اپنے لختِ جگر کے لیے جن کے جسم پر نا کافی

لباس تھا۔ پھر سردی تو لحافوں میں دبکے لوگوں کے نام پوچھ رہی تھی اسے اپنے وجود سے نفرت ہوگئی تھی۔ آخر کیوں کیا تھا انھیں پیدا اگر وہ انھیں پیٹ بھر کھانا اور جسم بھر کپڑا مہیا نہ کر سکتی تھی ...! اس نے سوچا۔

بارش اور ہوا کے جھکڑوں نے بڑی بڑی عمارتوں کے پاؤں ہلا دیئے تھے پھر اس کے کپڑے کے خیمے کی کیا بساط! پچھلی چار راتیں اس نے سڑک کے مقابل نئی تعمیر شدہ ملگیوں کے چھجوں کے نیچے بسر کی تھی، موسم کے بدلنے سے دونوں بچوں کو بخار ہو گیا تھا۔ بڑا لڑکا جوں توں کر کے سنبھالا لے چکا تھا مگر چھوٹا ابھی تک بخار سے پھنک رہا تھا۔ اسے اپنے آپ پر بے طرح غصہ آ رہا تھا۔ مگر وہ کرے تو کیا۔ خود بھی بری طرح کانپ رہی تھی یہ الگ بات ہے کہ اُسے خود کا ہوش نہ تھا فی الحال تو اُسے اتنا ہی ہوش تھا کہ موٹر کار میں بیٹھے بیٹھے استفسار کرنے والی اس موٹی بکری کو کسی نہ کسی طرح پھانسا جائے۔ اُس کے ہاتھ برق رفتاری سے کیچڑ میں لتے مرتبانوں کو صاف کرتے رہے اور وہ ایک چابی کی گڑیا کی مانند دوڑ دوڑ کر مرتبان جمع کرتی رہی۔

”ایسے کتنے مرتبان دے سکو گی ... ؟“ موٹر نشین میم صاحبہ نے خدا خدا کر کے بڑی احتیاط سے اپنا پیر نیچے رکھتے ہوئے پوچھا۔

گوری کی جان میں جان آگئی اور وہ لپک کر موٹر کے قریب پہنچ گئی۔

”اماں ... بدن دکھتا ہے .. اماں ... اماں سُن تو ..“ چھوٹا لڑکا لپک کر گوری کے پاؤں سے لپٹ گیا مگر گوری پر اس کی فریاد کا کوئی اثر نہ ہوا۔

”اماں ... میری بات نہیں سنتا ... ؟ لڑکا مجسم فریاد بن گیا۔

موٹر نشین میم صاحبہ نے اپنا وقت برباد ہوتا ہوا محسوس کیا اور نیچے اترتے والے پاؤں کو سڑاپ سے اندر کر لیا۔ گوری کی تو سانس اٹک گئی تقریباً پانچ چھ دن کے بعد ایک گاہک کو اپنے ڈیرے پر دیکھ کر اس کی بھوکی آنتوں کی جلن ذرا مدھم پڑ گئی تھی مگر میم صاحبہ کے تیور دیکھ کر اس کے پیٹ میں الاؤ بھڑک اٹھا۔

”کیا ہوا ماں جی ... ؟ مارے گھبراہٹ کے وہ بند ہوتے دروازے کے بیچ

حائل ہوگئی۔

"نہیں رہنے دے۔ پھر کبھی دیکھا جائے گا۔" میم صاحبہ گوری کو پرے ڈھکیل کر موٹر کا پٹ بند کرنے کی فکر میں تھیں۔

"نہیں ... نہیں ماں جی کچھ تو لیتی جائیں .... یہ والا ... یہ دوسرا والا ... یہ بہت اچھا رہے گا اس کے تو بیج بھی ہیں۔" اس نے بھاگ بھاگ کر مرتبانوں کا ایک ڈھیر لگا دیا۔ اس کی دانست میں اب موٹر کا پٹ بند نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ کیا کرتی ہے .... ؟ ہٹا یہاں سے۔ میم صاحبہ نے ناک سکیڑ کے کہا۔ جیسے گوری انسان نہیں بلکہ سڑک کے بیچ مری پڑی مردار بلّی ہے ... مگر گوری کہاں بُرا ماننے والی .... !! افلاس نے تو اُس کی خودداری اور غیرت کو بے مول نیلام کر دیا تھا۔

آپ کے جو ایمان میں آئے دے دینا۔ میرے بچے بھوکے ہیں۔" وہ گھگھیانے لگی۔

اچھا بتا ایسے کتنے مرتبان دے سکے گی ... ؟ میم صاحبہ نے ایک مرتبان کی نشاندہی کی۔

"آپ جتنے چاہیں۔" گوری ہر طرح میم صاحبہ کو مطمئن کرنا چاہتی تھی۔"

سو.. ؟ ؟ میم صاحبہ نے سوال کیا۔

"سو مرتبان ... ؟ ؟ ؟ " گوری کی سٹّی گم ہوگئی اور حیرانی سے اس کی آنکھیں اتنی پھیلیں کہ اس کے چہرے پر سوالیہ نشان بن گئیں۔

"میں نے کہا نا یہ سودا یہاں نہیں ہونے کا ... اب ہٹ جانے دے" ایک بار پھر میم صاحبہ کے ابروؤں میں بل پڑ گئے۔

آپ کو سو مرتبان چاہئیں ... !! گوری اپنی حیرانی دبا نہ سکی۔

"اماں .... اماں چھوٹا کپکپا رہا ہے۔ اس کا بدن اینٹھ رہا ہے۔" یہ اس کا بڑا لڑکا تھا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے اسے اندر ڈیرے میں لٹا دے" اس نے اپنے بڑے

لڑکے کی اطلاع پر دھیان دینے کی ضرورت محسوس نہ کی اور وہ میم صاحبہ کے اور قریب کھسک آئی۔

اماں جی آپ سچ مچ سو مرتبان خریدیں گی ... ؟ اس نے پھر وہی سوال دہرایا۔

"ہاں اس میں اتنے تعجب کی کیا بات ہے؟ میں فوڈ کنٹینر رد ہوں کچھ خاص قسم کے کھانے تیار کر کے ملک سے باہر بھیجتی ہوں۔ اِس لیے مجھے اتنے سارے مرتبان ایک ساتھ چاہئیں۔ بس اسی سائز کے۔"

ہاں ہاں لے لیں۔ یہ سب لے لیں .... ارے ... آپ سو کی بات کرتی ہیں .... میں تو ... میں تو دو سو مرتبان ایک ساتھ دے سکتی ہوں۔" مارے خوشی کے وہ گڑبڑانے لگی۔ "نہیں نہیں مجھے تو بس سو ہی چاہئیں اور وہ بھی اس سائز کے۔" انھوں نے ایک انگلی کے اشارے سے ایک مرتبان کی نشاندہی کی۔

"ابھی لے لیں۔" اب گوری کے ہاتھوں میں وہ طاقت آگئی تھی کہ اللہ کی پناہ ...! دوڑتی جاتی اور ... مرتبان اکٹھا رکھتی جاتی تھی۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ سو مرتبان ...! ایک ساتھ ...!! اتنے سارے مرتبان ایک ساتھ اس نے کاہے کو بیچے تھے۔ اور پھر سو مرتبانوں کے ایک ساتھ بکنے سے اس کا اچھا خاصا فائدہ ہو سکتا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ مال کی قیمت خرید تو وہ غلّے میں ڈال دے گی۔ مگر منافع چھپا لے گی۔ اپنے شوہر کو بتا لگنے نہ دے گی اور اس پیسے سے وہ پرانے کپڑوں کے بازار سے اپنے بچوں کے لیے ڈھیر سارے کپڑے اور ... اوڑھنے کے لیے گدڑیاں خریدے گی۔ پچھلے پانچ دنوں میں لوگوں نے شاید لحافوں سے جھانکنے کی ہمت تک نہ کی ہو ... مگر اس کے جگر گوشے کپڑے کے خیمے اور ناکافی لباس سے کس بری طرح سے اینٹھ رہے تھے کتنی خوش ہو گی جب اپنے بچوں کو جسم بھر لباس پہنا دیکھے گی .... اِس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔

"اماں چھوٹو کا بدن بری طرح اینٹھ رہا ہے .... اماں ... اماں سن تو ... چھوٹو مر جائے گا .... اماں" بڑا لڑکا رونے لگا۔

"بیٹا ... یہ کیا میں اپنے لیے کر رہی ہوں۔ یہ سب تو تمہارے لیے ہی ہے۔ جا ... اُسے ڈیرے کے اندر لے جا کر سلا دے۔" وہ اپنے بڑے لڑکے کو

ہدایت کرنے لگی۔

"اماں اندر سوکھی جگہ کہاں ہے۔ وہاں دوکان کے چھجے کے نیچے سیٹھ آنے نہیں دیتا۔ آج سب اپنی اپنی دوکانیں صاف کر رہے ہیں"

گورجی نے سر گھما کر اپنے بیمار لڑکے کی طرف دیکھا۔ لوہے کے ٹھنڈے سندوق پر پڑا وہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔ دل میں ممتا کا ایک طوفان اٹھا۔ آنکھوں میں بے بسی چبھنے لگی .... مگر... اس نے آنسو ڈھلکنے نہ دیئے اور اپنے ہاتھ صاف کرتی ہوئی اپنے لڑکے کی جانب جانے لگی، پتا نہیں پھر کیا ہوا... وہ پلٹ کر آئی اور میم صاحب کی صورت تکنے لگی... کہ کہیں اس کے لڑکوں کی دخل اندازی ان پر گراں نہ گزری ہو۔

"اسے بہت بخار ہے اماں جی... اچھا بتاؤ۔ یہ مرتبان کہاں رکھوں....؟"

"اماں... اماں سن... نہیں تو بہت دیر ہو جائے گی ... چھوٹو ٹھٹھر جائے گا" بڑا لڑکا اس کے سر ہو گیا۔

بیٹا! یوں کر۔ اپنی قمیص اتار کر اُسے اڑھا دے۔ ابھی آتی ہوں۔ بس یہ مرتبان گاڑی میں رکھنے ہیں۔" اتنا کہہ کر وہ خود سے بے خبر ہو گئی .... دوڑ دوڑ کر مرتبان گاڑی کی ڈِکی میں جماتی رہی دل ہی دل میں حاصل ہونے والے منافع کا جمع و خرچ بھی کرتی رہی کہ کس طرح وہ اپنے بچوں کے لیے ڈھیر سارے کپڑے خریدے گی۔ انھیں جسم بھر پہنائے گی' ایک لمحے کو اس کے ہاتھ تھرتھرا اٹھے اس خیال سے کہ کیا وہ لمحہ وہ برداشت کر سکے گی جب وہ اپنے جگر گوشوں کو جسم بھر لباس پہنا دیکھے گی... !مارے خوشی کے اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سانس بے ترتیب ہو گئی۔

خدا خدا کر کے جب وہ سارے مرتبان گاڑی کی ڈکی میں رکھ چکی اور میم صاحبہ سے پیسے بھی وصول کر چکی تو اس کی جان میں جان آگئی۔۔ مگر۔ اس کے آگے ایک اور مرحلہ تھا۔ مال کی رقم الگ کر کے اُسے غلہ میں ڈالنا تھا۔ اور منافع الگ کرنا تھا۔ اور یہ کام اُسے بڑی تیزی سے کرنا تھا کیونکہ اس کا مرد اب آنے ہی والا تھا۔ اور اس کے ہاتھ لگا پیسہ یا تو ٹھرے کی نذر ہو جاتا تھا یا پھر مزید مال لانے

کی چکر میں غرق ہو جاتا تھا۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ ہرگز ایسا ہونے نہیں دے گی، منافع کے پیسوں سے وہ صرف اور صرف لباس خریدے گی۔

وہ روپیے حساب کر کے جلدی جلدی غلّے میں ڈالتی رہی۔ جب سارا حساب کتاب ہو چکا اور منافع کا روپیہ بھی الگ کر لیا تو اُس نے رقم کو آنکھوں سے لگایا اور مٹھی میں دبوچ لیا۔

"اماں... آخر تو نے بڑی دیر کر دی.." اس کے بڑے لڑکے کا چہرہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔

"کیا ہوا بیٹا....؟" اُلٹا وہ اپنے لڑکے سے استفسار کرنے لگی۔

"کیا ہوا... ! میں بتاتا ہوں" یہ اس کا میاں تھا جو بری طرح اس کی پیٹھ پر گھونسے مار رہا تھا وہ بے طرح پٹتی رہی۔ مگر کیا مجال جو ذرا بھی اپنی مٹھی کی گرفت ڈھیلی پڑنے دی ہو اس کی بند مٹھی بند رہی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کے بڑے لڑکے نے اپنے باپ سے چغلی کھائی کہ اس نے منافع کے پیسے چھپا کے رکھ لیے ہیں۔ مگر گوری کہاں نچلی بیٹھتی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے جتنا پِٹے مگر وہ بند مٹھی ہرگز نہیں کھولے گی۔ مٹھی میں تو اس کی متاعِ حیات بند تھی۔ وہ پٹتی رہی.... پٹتی رہی.... پٹتی رہی.... مگر کب تک؟ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ادھ موئی تو تھی ہی۔ ہاتھ چلا نہیں سکتی تھی... گالیوں پر اتر آئی۔

"چاہے میری جان لے لے... مگر میں ہرگز تجھے نہیں دوں گی"

"تو کسی کو کیا دے سکتی ہے، لے سکتی ہے... آج تو نے میرے بیٹے کی جان لے لی... کمینی... بدذات ... وہ دیکھ..."

"کیا... !!" گوری نے دوڑ کر ٹھنڈے صندوق پر ٹھٹھرے ہوئے اپنے لختِ جگر کو چھوا۔ لوگوں کی بھیڑ دیکھی.... بس اس کے آگے اُسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اس کی بینائی سلب ہو گئی۔ اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ پتا نہیں کتنی دیر تک... جب دوبارہ اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے دیکھا کہ اس کا میاں بھی اُس کے پاس بیٹھا رو رہا ہے"

"گوری یہ تو نے کیا کیا.... ! اب میں کیا کروں؟ میرے پاس تو اتنی رقم

بھی نہیں کہ اس کے کفن دفن کا انتظام کر سکوں... جیتا آدمی تو ننگا بھی جی لے...
مگر مر کر تو اُسے جسم بھر پوشاک چاہیئے نا...!"

ساری بات گوری کی سمجھ میں آگئی۔ کتنا بڑا غضب کیا تھا۔ اس نے...!
جس آشیاں کے لیے اس نے تنکا تنکا جمع کیا تھا اُس آشیاں کی ضرورت ہی مرگئی
تھی۔ اب اُسے اور.... اور اس کے آگے وہ سوچ بھی نہ سکی۔ غم کا غلبہ اس بار
اس شدّت کا ہوا کہ اس کا سر بری طرح چکرانے لگا.... سانس بے ترتیب ہوگئی۔
وہ زندگی جسے حوادثِ زماں کے پیروں تلے روندے جانے کے باوجود اس
نے سمیٹ کے اپنے اندر دبوچ رکھا تھا، کیسے دھواں دھواں اِس کی آنکھوں کے آگے
اڑی جارہی تھی... کتنی بے بس ہوگئی تھی وہ..... اُس کا اپنا جسم لمحہ بھر میں
کیسا پرایا ہوگیا تھا...! وہ اپنے ہاتھ ہلانا چاہتی تھی مگر نہیں اٹھا پاتی تھی...
ایک نظر اپنے جگر کے ٹکڑے کو دیکھنا چاہتی تھی مگر... بے بسی کی باڑھ یوں چڑھ
آئی تھی کہ روشنی کے جزیرے ہی زیرِ آب ہوگئے تھے۔

"گوری.... اب تو ہی بتا میں کیا کروں.... کہاں سے لاؤں اتنا روپیہ
...؟ غریب تو میں تھا ہی مگر... مر کر تو اس لڑکے نے مجھے ننگا کر دیا...!!"

"تم روتے کیوں ہو جی... اِس کا انتظام تو میں نے پہلے ہی سے کر رکھا
ہے.... یہ لو...!"

پوری طاقت سمیٹ کر اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور اپنے میاں کی آنکھوں
کے آگے اپنی بند مٹھی کھول دی جس میں سفید لٹھے کی ایک تھان اڑسی پڑی تھی۔

۸ر دسمبر ۸۹ء

قمر جمالی

"یہ کیا کرتے ہو بھائی ــــ !" میں نے دوڑ کر اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیا جس کے ناخن تقریباً آدھا انچ لمبے تھے اور جس سے وہ مسلسل اپنی پیشانی کے زخم کو نوچ رہا تھا۔ زخم سے خون رِس کر اس کی انگلیاں لہولہان ہو جاتیں تو وہ بڑا مسرور نظر آتا، پھر گھڑی دو گھڑی میں خون منجمد ہونے لگتا تو وہ پھر وہی عمل دہراتا۔

"کیا ایسا کرنا ضروری ہے ــــ ؟" میں نے پوچھا۔ اس نے یک ٹک میری طرف حقارت سے دیکھا اور ہاتھ چھڑانے کے لئے جد وجہد کرنے لگا۔

"مجھے اندازہ ہو گیا تھا تم بھک منگے نہیں ہو۔ اس طرح اوروں سے بچ کر، لوگوں سے چھپ کر زخم کریدنے سے کیا حاصل ــــ ؟" میں نے اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک غلط نظر سے میرے پیکر کا جائزہ لیا اور پھر میری گرفت سے آزاد ہونے کے لئے جد وجہد کرنے لگا۔

"بے کار ہے۔ تم کامیاب نہ ہو سکو گے۔ اٹھو اور چپ چاپ میرے ساتھ چلو۔" میں نے کہا اور اس کے چہرے پر اپنی پیشکش کا ردِ عمل دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا میری پیشکش سے اس کے رخسار پر سرخی نمودار نہیں ہوئی بلکہ آہستہ آہستہ اُس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں اور باچھیں پھیلتے پھیلتے تمسخر آمیز قہقہے میں بدل گئیں۔ میں نے سمجھا کہ وہ بڑا چالاک ہے اور اپنے ہاتھ سے میری گرفت

ہٹانے کے لئے ڈھونگ کرنے لگا ہے۔

"تم مجھ پر بھروسا کر سکتے ہو۔ میں ایک شریف انسان ہوں اور۔ ۔ میرا نام۔ ۔ ۔ ۔"

"باتش ــــ" اُس نے تیزی سے اپنا دوسرا ہاتھ میرے منھ پر رکھ دیا۔ یکایک اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اس حالت میں اس کا چہرہ بڑا خوفناک ہو گیا۔ مجھے وحشت ہونے لگی۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس سے ہزاروں سوال کر ڈالے مگر اس کی نگاہوں نے میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ وہ بڑی دیر تک یوں ہی میرا منھ بند کئے کھڑا رہا اور جب تھک گیا تو خود ہی اس نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

"کیا حرج ہے ــــ؟" میں نے حیران ہو کر اس سے پوچھا۔

"بہت فرق پڑتا ہے ــــ چاہتوں اور ضرورتوں کے جنگل سے ماٹی اٹھا لائی، ضمیر سے خمیر اٹھایا حسن کا آکار دیا اور انا کی لیپ چڑھائی۔ بس یہی پہچان کافی نہیں کیا ــــ ؟ تم بھی اوروں سے کیا مختلف ہو۔ وہی ہتھیار لئے گھومتے ہو۔ اس تین اکشر والے ترشول ہی کو میں نے اپنے ناخنوں میں چھپا لیا ہے۔ اسے خون پینے کی عادت ہے۔ اگر اپنے جسم کا خون نہ دیا تو یہ ترشول آزاد ہو جائے گا۔"

یکایک موٹر کاروں اور موٹر سیکلوں کے ہارن کا شور و غوغا سن کر ہم دونوں ہی نے یکلخت سر اٹھا کے اوپر دیکھا۔ سڑک پر ہماری وجہ سے کافی بھیڑ جمع ہو گئی تھی اور ٹریفک میں خلل پڑ گیا تھا۔ پوں پوں کی آواز سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ میں اس کی طرف وہ میری طرف گھورے جا رہا تھا۔ دونوں ہی کی عقل سلب ہو گئی تھی۔ اپنی جگہ سے ہلتے نہ تھے۔

"ابے دیکھتا کیا ہے۔ مار سالے کو۔ ڈھونگ کرتا ہے۔ سالے اِن بھک منگوں نے تو سماج کو کھوکھلا کر دیا ہے۔" پھر وہ طوفانِ بدتمیزی اٹھا کہ الاماں الحفیظ۔ پتھروں جوتوں کا ڈھیر لگ گیا۔ پولس آئی اور ہم دونوں کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا۔ زخمی وہ بھی تھا اور زخمی میں بھی، مگر نہ وہ مسی کرتا تھا اور نہ میں۔

دوسرے دن سب کی نظریں بچا کر ہم وہاں سے نکل چلے کیونکہ اب اس کے زخم پر کھرنڈ آنے لگی تھی اور وہ شدت سے تجدیدِ ناخن کاری کی ضرورت محسوس کر رہا تھا اور میں ــــ میں اپنے پاؤں کے سیلِ رواں کو منجمد ہوتا محسوس کر رہا تھا۔ ہم دونوں ہی نے ایک دوسرے کو اپنے فرار کے منصوبے کے بارے میں نہیں بتایا تھا مگر حوالات کی کھڑکی سے کود کر میں نے

جوں ہی اپنے اطراف کا جائزہ لینا چاہا تو وہ بالکل میرے پاس کھڑا تھا۔ "ضرور ہمیں مشترک ہوں تو رشتے آپ ہی آپ بن جاتے ہیں" میں نے سوچا۔

"چلو ہم ساتھ چلتے ہیں ۔۔۔" اُس نے کہا۔

"کہاں ۔۔۔!!" کیونکہ میں خود نہیں جانتا تھا یہ چلنا کیا ہوتا ہے۔ میں تو جسموں کو وقت کے سیلِ رواں کے ساتھ بہانے کا قائل ہوں۔

"تمہارے گھر ۔۔۔" اس نے کہا۔

"یہ گھر کیا ہوتا ہے ۔۔۔؟" میں حیران تھا۔

"مکان ۔ ۔ ۔ مکان ۔ ۔ ۔" وہ مجھے سمجھانے لگا۔

"مکان ۔۔۔! یہ مکان کیا ہوتا ہے ۔۔۔!!" میں بہت حیران تھا کیونکہ میں جانتا نہ تھا۔

"گھر نہیں سمجھتے ۔۔۔ مکان نہیں جانتے ۔۔۔ استھان تو سمجھتے ہونا ۔۔۔؟" وہ آگ بگولہ ہو گیا۔ مگر میں حیران تھا۔ کیونکہ وہ مجھے ایسی باتیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا جو میں نے سیکھی ہی نہ تھیں

"استھان نہیں سمجھتے۔! اسی شبد کو لے کر بھومی پر خون خرابہ ہو رہا ہے۔ تم اخبار نہیں پڑھتے کیا ۔۔۔؟"

"یہ اخبار کیا ہوتا ہے ۔۔۔!"

"کیا ۔۔۔!!" اس نے بڑی حقارت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"او ہو ۔۔۔ میں سمجھ گیا ۔۔۔ تاریخ کہو تاریخ ۔۔۔" میں اپنے تئیں خود کو کافی ذہین سمجھتا تھا۔

"یہ تاریخ کیا ہوتی ہے ۔۔۔؟" اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ سنو۔ شبد ھ کال چکر پر سوار ہو کر گردش کرتے ہیں۔ راستے کی گرد اور سفر کی تکان سے اِن کے روپ بدلتے رہتے ہیں۔ اور شبدھ جب جب نیا روپ دھارتے ہیں تاریخ بنتی ہے۔"

وہ تاریخ کی اس تعریف کو سُن کر پہلے تو الجھا الجھا سا لگا پھر آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر اطمیناں ابھر آیا۔ پھر اس نے اپنی آنکھوں کے کنارے سیکیڑ کر اوپر نیچے سر ہلا کر میری وضاحت کی توثیق کر دی۔

"چلو میں تمھیں بتاتا ہوں کہ استھان کیا ہوتا ہے ۔۔۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا دوڑنے

لگا۔ دوڑتے دوڑتے ہم بستی سے بہت دور نکل گئے تھے۔ اب یہاں سے شاید جنگل یا پھر جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا اُس نے اطمینان کی سانس لی۔ اب وہ دوڑ نہیں رہا تھا چل رہا تھا۔ مجھے بڑا مزہ آرہا تھا۔ کیونکہ ان رنگین نظاروں میں مجھے کیا کچھ نہ دکھائی دیتا تھا ـــــ!

"آگے ایک نہر ہے۔ وہاں چلتے ہیں" اُس نے کہا۔

اب پھر اس کی رفتار تیز ہوگئی تھی میں بھی کسی TOE کی ہوئی مردہ انجن کی گاڑی کی طرح اس کے پیچھے لپکا جارہا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ رک گیا اور بڑی بڑی آنکھیں نکالے اندھیرے میں کچھ کھوجنے لگا۔ پھر یکایک پتا نہیں کیا ہوا یا پھر یہ کہ وہ خوش ہو رہا تھا کیونکہ اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکلنے لگی تھیں۔ اس نے میرا ہاتھ اتنی زور سے دبایا کہ میری چیخ نکل گئی اور سناٹے میں دور تک پھیل گئی۔ پھر کسے بے شمار پرندے اپنے ٹھکانوں سے اُڑ گئے۔ اب حدِ نظر تک آسمان پر پر ہی پر تھے اور ماحول میں چائیں چائیں "!

بڑی پُر فضا جگہ تھی۔ بازو سے جھر جھر بہتی ندی کا جل ترنگ اور فرش پر حدِ نظر تک گنجانی قالین ـــــ اور ہواؤں کی لہروں سے بندھے مختلف سُر۔ بیچوں بیچ ایک ٹوٹا پھوٹا مٹی کا چبوترا تھا جس کے اطراف خودرو بیلوں کا حصار تھا۔ وہ مجھے گھسیٹ کر اُس چبوترے پر لے گیا اور خود بھی دھم سے گر کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ میں بھی بڑی دیر تک اس کے برابر لیٹا رہا مگر پھر خیال آیا اِس قدرتی خطے میں یہ مصنوعی چبوترا ـــــــ!! اچانک مجھے لگا جیسے برقی تار بدن سے چھو گیا ہو۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ دور دور تک کوئی نظر نہ آتا تھا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا، اور میری پریشانی کو محسوس کر کے محظوظ ہو رہا تھا۔ میرے جسم میں خون شدت سے گردش کرنے لگا اور آنکھوں اور کانوں سے گرم گرم شعلے اٹھنے لگے۔ تناؤ اتنا بڑھا کہ میرے ہاتھ سخت ہو گئے، میرے ناخن باہر نکل آئے، جبڑے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے اور آنکھیں اُبل پڑیں میں نے ہزار کوشش کی کہ اپنے حواس میں لوٹ جاؤں مگر نہ ہوا اور میرے ہاتھ بڑھتے بڑھتے اس کی گردن تک چلے گئے۔ میں نے جوں ہی اس کی گردن پر دباؤ دگنا کرنے کے لئے اپنے گھٹنوں پر بیٹھنا چاہا میری آنکھیں اُس کی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔ نہیں وہ مسکرا نہیں رہا تھا بلکہ مسکراہٹ کی بارش کر رہا تھا۔ اُس کے چہرے سے اٹھنے والی ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار سے میرے خون کی گردش مدہم ہو گئی، جسم میں خُنکی آگئی اور جسم کا تناؤ کم ہو گیا۔ میرے

ہاتھ کے عضلات ڈھیلے پڑ گئے اور ناخن اندر دھنس گئے۔ حواس بحال ہوئے تو مجھے شرمندگی ہوئی۔ میں نے اس کے مقابل لیٹ کر دوسری طرف کروٹ بدلی اور خرخٹ سو گیا

دوسری صبح جب میں جاگا تو وہ میرے پہلو میں نہیں تھا میں اٹھ بیٹھا اور گردن گھما گھما کر اسے تلاش کرنے لگا۔ دور ندی کی سمت سے وہ آتا دکھائی دیا۔ قریب آیا تو بڑا صاف ستھرا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے ایک دھوتی باندھ رکھی تھی، ماتھے پر بھبھوت مل لیا تھا، اس کے سر پر چوٹی اُگ آئی تھی اور وہ بڑی کریہہ آواز میں مسلسل کوئی راگ الاپ رہا تھا۔ جیسے کوئی اک تارہ یکساں دُھن پر بج رہا ہو۔

رام ــــ!! میرے منھ سے نکل گیا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور چبوترے پر آکے بیٹھ گیا۔ میں بدک کر ایک ہاتھ دور ہٹ گیا۔ وہ بدستور مسکراتا رہا۔

”اب تم اٹھو اور ندی پر اشنان کرلو۔ من کی پاکی سے پہلے تن کی پاکی ضروری ہوتی ہے۔ یہاں براجمان ہو جاؤ“ اس نے کہا۔

”میں تیرے بازو نہیں بیٹھوں گا۔ بہروپیا ہے تو ــــ آج تیرے سر پہ چوٹی اگ آئی ہے اور۔۔۔۔ میں جانتا ہوں تیرے اس کمنڈل میں کیا ہے ــــ میں تیری چوٹی کاٹ دوں گا“

”وہ پھر اُگ آئے گی“ وہ بڑا مطمئن نظر آنے لگا۔

”میں پھر کاٹ دوں گا“ میں گرجنے لگا۔

”وہ پھر بھی اُگ رہے گی“ پھر اُس نے چپاک سے آنکھیں بند کرلیں اور اُسی کریہہ آواز میں ماحول کو ہیبت ناک بناتا رہا۔ میں نے اب اُس سے منھ لگنا مناسب نہ سمجھا۔ ندی پر گیا اپنے آپ کو پاک کیا اور لوٹ آیا۔

”آؤ آؤ لالہ دین ــــ“ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر اُس نے کہا تو میرے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ اُسے کیسے پتا چل گیا کہ میں لالہ دین ہوں۔

”جیسے تم نے مجھے رام نام دیا“ اُسے میرے دل میں اُٹھنے والی ہر بات کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب اس کی طرف نہیں دیکھوں گا، اور دل کی تسکین کے سامان کروں گا۔ مگر جوں ہی میں نے

---

۱ : سادھو کے ہاتھ کا پیتل لوٹا۔

چبوترے پر پاؤں رکھا، چبوترہ دو نصف دائروں کی شکل میں شق ہو گیا اور بیچ سے راستہ بن گیا۔ اب ایک طرف وہ بیٹھا رہا اور دوسری طرف میں۔ وہ اپنی آواز میں الاپتا رہا اور میں نے اپنی سانسوں میں آری لگا لی۔

بائیں طرف وہ رہ گیا اور دائیں طرف میں ہٹ گیا۔ مگر ایسا کب تک چلتا۔ بہت جلد ہی ہم دونوں بیزار ہو گئے۔ پھر ایک رات ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ محنت کرنی چاہیئے۔ دونوں جنگل سے جھاڑ پات کاٹ کر لائے۔ ٹہنیوں کو جھکا جھکا کر زمین پر نصف دائرے بنائے گئے۔ پھر ان پر پتوں اور بیلوں سے سائبان کیا گیا۔ اب دونوں بازو بے حساب سائبان تیار ہو گئے۔

ایک صبح پہاڑوں میں آگ لگ گئی۔ دامن میں بسے لوگ تتر بتر ہو گئے۔ جلے لباس اور سڑے جسموں سے دوڑتے دوڑتے لوگ اس کنج تک پہنچے اور زمین پر بے حساب سائبان بنے دیکھ کر چیونٹیوں کی طرح ایک ایک میں ایک ایک نفس گھس گیا۔ اندر ہی اندر ایک کے دو ہوئے اور دو کے چار۔ فیض اُدھر بھی بٹتا رہا، فیض اِدھر بھی بٹتا رہا۔ اب تو دائیں اور بائیں دونوں بازو اخبار بھی چھپنے لگے — تاریخ بھی بننے لگی۔ جنگل میں منگل ہو گیا۔

مگر اب — ہمارا دل اچٹ گیا تھا۔ ہم نے سوچا اب ایک چمتکار کرنا چاہیئے۔ دونوں نے مل کر منصوبہ بنایا۔ اپنے اپنے جسموں کو ان ہی جلتے پہاڑوں کی گپھاؤں میں چھپا دیا اور ہوا میں تحلیل ہو کر تماشا دیکھنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چبوترے کے دو نصف مل گئے اور ایک دائرہ بن گیا۔

صبح کہرام مچ گیا۔ بائیں بازو نے تمام انگلیوں اور انگوٹھے کو بھینچ کر مٹھی بنائی اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ دائیں بازو نے تین انگلیاں اور انگوٹھے کو ملا کر کلمے کی انگلی کو ہوا میں لہرایا اور اعلانِ جنگ کر دیا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ بائیں بازو والے کہتے کہ ایشور نے سمادھی لے لی — اب یہاں رام لالے کا مندر بنے گا۔ دائیں بازو والے کہتے وہ بھلے ہی رام کا مندر بنا لیں مگر لالہ دین اسلام پر تھا۔ وہاں ایک یادگار بنے گی۔ ہاتھ سے ہاتھ بھڑ گیا۔ پھر گردنیں دبوچی گئیں۔ آہ و بکا چیخ پکار، المدد الغیاث . . . . رام راج زندہ باد۔ فضا میں جگہ جگہ چھید پڑ گئے۔

لوگوں نے خود ہی اپنے سائبان ڈھا لیئے۔ دائیں بازو کی انگلیاں بائیں نے کاٹیں اور بائیں کی دائیں نے۔ زمین خون خون ہو گئی۔ لڑتے لڑتے وہ چبوترے پر چڑھ آئے اور وہ دھما چوکڑی مچائی کہ تھوڑا تھوڑا کر کے سارا چبوترہ ڈھے گیا۔ لوگ لڑتے لڑتے بھول گئے کہ لڑائی انھوں نے کب اور کیوں شروع کی تھی یہ کوئی چبوترہ تھا شاید، "کسی نے کہا۔ مگر وہاں کوئی چبوترہ نہیں تھا۔

بہت ڈھونڈا کئے۔ ادھر دوڑا، اُدھر بھاگا۔ آخر تھک ہار کر نڈھال نڈھال خود بھی زمین پر گر گئے۔ مگر سب زخمی تھے۔ کسی کا ہاتھ کٹا۔ کسی کا پاؤں، کسی کے کان کٹے، کسی کی ناک اور کسی کا صرف جسم ہی جسم رہ گیا آتما گھبرا کر نکل گئی اور کسی کے صرف آتمارہ گئی تو جسم ریزہ ریزہ۔

ہم دونوں اوپر ہی اوپر فضا سے نظارہ کرتے رہے۔ پھر کئی دن بعد کچھ لوگ اُٹھے جیسے طویل نیند سے بیدار ہوئے ہوں۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ آپس میں علیک سلیک ہوئی اور ایک دوسرے سے دریافت کرنے لگے کہ وہ کون ہیں اور یہاں کیوں پڑے ہیں؟ یہ سڑا گلا گوشت کس کا ہے؟ یہاں کی زمین سرخ کیوں ہے۔؟؟

کچھ دیر بعد وہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے پھر جدھر سینگ سمائی بھاگ کھڑے ہوئے۔

اب ہم دونوں نے سوچا کہ ناٹک کا انتم بھاگ بھی ہو گیا۔ چلنا چاہئے کیونکہ میرے پاؤں میں لگی چکریاں اب آپ ہی آپ گھومنے لگی تھیں اور وہ بھی بے چین ہو رہا تھا۔ ان جلے بھنے پہاڑوں کی گپھاؤں سے اپنے سفر بیرا اٹھائے اور اپنی اپنی راہ لی۔

ایک یگ بیت گیا مگر زمانے بعد پھر ایک دن اسے سڑک کے کنارے دیکھے اپنی پیشانی کے زخموں کو اپنے لمبے لمبے ناخن سے ہرا کرتا ہوا دیکھ کر میں اُسے پہچان گیا۔ وہ بھی کم چتر نہ تھا۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر اس نے خود ہی اپنے ہاتھ روک لئے۔ اور آواز دی۔

"آؤ آؤ خضر علی۔

آج میں حیران نہیں ہوا کیوں کہ اس کی چالاکی کا میں قائل ہو گیا تھا۔ مگر کچھ کہنے کے لئے میں نے جوں ہی زبان کھولی، اُس نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے جھٹکا دے کر مجھے روکا۔

"نہیں بھئی اب میں رام نہیں ہوں جیسے تم لالہ دین نہیں رہے۔ اب لوگ اخبار نہیں پڑھتے محسوس کر لیتے ہیں۔ اور تاریخیں لکھی نہیں جاتیں آپ ہی آپ بن جاتی ہیں۔ اب لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ رام ہوں یا لالہ دین۔ چترائی کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی ہے۔ اب تو سب ہی رام ہیں اور سب ہی رحیم۔ اب میں نے بھی اپنا اصلی روپ دھارن کر لیا ہے۔ چر نجیوی۔

۱۸ر نومبر ۱۹۹۰ء

قمر جمالی

مجسمہ

"فنکار! میرے لیے ایک بھائی بنا دو گے؟"
"کیا کہا — ! دل لگی دل والوں سے کی جاتی ہے؟"
"بہت بدتمیز ہو۔ بات کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔"
"ہنس کیوں رہے ہو؟ اپنے کام سے کام رکھو۔ کتنی اُجرت لوگے؟"
"ایسی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہو؟ میں بہت سنجیدہ ہوں۔"
"اُجرت کے لیے مطمئن رہو۔ جتنا مانگو گے اُس سے زیادہ ہی دوں گی۔
مگر.... کام بہت سلیقے سے کرنا ہوگا۔"
"یہی کوئی تین چار دن میں تیار ہو جانا چاہیئے۔ اب غور سے سنو۔ قد دراز ہوگا اور شکل میری مشابہ۔ بالکل میرا ہمشکل ہو۔ یہ ایسی پھٹی پھٹی نظروں سے کیا دیکھ رہے ہو؟"
"میں تو سمجھتی تھی کہ فنکار کی نظریں عمیق ہوتی ہیں۔ مگر... تم تو بہکی بہکی نگاہوں سے دیکھتے ہو۔"
"کیا کہا —— ! میرے مذاق کو سمجھنے سے قاصر ہو۔ ارے! تو یہاں مذاق کون کرتا ہے —— ! سچ کہتی ہوں فنکار مجھے ایک ہم شکل کی ضرورت ہے۔"
"ہاں ہاں۔ ٹھیک پہچانا۔ ایک بھائی کی ضرورت ہے۔ بالکل بالکل وہی بات ہے۔ تب ہی تو کہتی ہوں نا! دراز قد ہو۔ چوڑا سینہ اور وجیہہ مرد ہو تاکہ وقت پڑنے پر نہ صرف مجھے بلکہ شادی کے بعد میرے شوہر کو بھی اپنے پیچھے چھپا سکے۔"
"فنکار! ادھر دیکھو۔ میری ٹھوڑی پر یہ کالا تل کتنا نمایاں اور خوب صورت

معلوم ہوتا ہے۔ اُسے بھی بالکل اُسی مقام پر ایک تل ہونا چاہیے۔"

"ہاں ہاں۔ وہی تو بتا رہی تھی۔ عمر میں مجھ سے دو تین سال بڑا ہونا چاہیے یہی کوئی تیئیس، چوبیس سال۔ اور بال ——— بال ایک دم سلجھے اور باقاعدہ ترشے ہوئے ہوں۔ ناک کسی قدر پتلی اور اونچی ہو۔ میری طرح نہیں۔ میری ناک کا اگلا حصہ کسی قدر گول ہو گیا ہے جو مجھے بالکل پسند نہیں۔ اب یہ تو بات ہی دوسری ہوئی نا۔ میں اللہ میاں کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہوں۔ میری تخلیق میں میرا دخل کہاں!! مگر اب جو اسے اپنے ہی ہاتھوں بنانا ہو تو اپنی مرضی کے مطابق کیوں نہ ڈھالیں۔"

"فنکار! مسکراہٹوں کا مفہوم وقت اور حالات کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے۔ تمہارا مسکرانا مجھے ناگوار گزرتا ہے۔"

"خیر ——— کوئی بات نہیں ——— اچھا سنو۔ چہرے پر مونچھ ہونا ضروری ہے۔ مگر ——— ڈھنگ کی۔ ایسے نہیں کہ قومیت ہی بدلی نظر آئے۔"

"کیا کہا ——— ؟ ہاتھ ؟ ہاں ہاں وہی تو بتانے والی تھی۔ انگلیوں کے پور ایک دم مخروطی نہیں ہونے چاہئیں۔ مخروطی انگلیوں والے تلوّن مزاج ہوتے ہیں۔ سنو سب سے بڑی بات تاثرات ہیں۔ چہرہ گویا برنارڈ شا کا کھلا سماجی تبصرہ ہو۔"

"اوہو ——— تم کارل مارکس کی بات کرتے ہو۔ تمہارا خیال درست ہے۔ مگر میں سمجھتی ہوں مارکس کے نظریات کو شا نے ہی عام آدمی تک پہنچایا ہے۔ اور میرا بھائی میری ہی طرح ایک عام آدمی ہو گا۔ اور سنو! ہونٹوں کے کنارے ایسے سکڑے ہوں۔ گویا کہ وہ تھوک رہا ہو۔ میرے منگیتر پر۔"

"کیا کہا ——— ؟ ناانصافی ہے؟ نہیں فنکار! یہی تو حقیقی انصاف ہے۔ اور وہ ——— ؟ اسی کے مستحق ہیں۔ پچھلے دنوں انھوں نے میری ماں سے گھوڑے جوڑے کے لیے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کیا تھا۔ میری بیوہ ماں اتنی رقم کہاں سے لاتی ——— ! پھر میں نے ہی گھرانے کی عزت بچانے کے لیے خوب روپیہ کمایا۔ اپنے ہاتھوں سے ——— اپنے بل بوتے پر۔"

"نہیں جی! اتنے سیدھے سادے طریقے سے اپنی روپیہ، اتنا جلدی اکٹھا کہاں ہوتا ہے —! میں ماڈلنگ کرنے لگی ہوں — اور بھی بہت کام ہیں میرے۔"

"اس میں تعجب کی کیا بات ہے —!"

"کیا کہا —! حیرت ہے۔ کس پر —؟ میری قابلیت پر یا میری صاف گوئی پر —؟؟" صاف گوئی میرے خمیر کا جزء ہے۔ اور قابلیت؟ وہ تو میں بہت قابل ہوں۔ نام بھی کتنا خوب صورت ہے میرا —! شہلا ہے شہلا۔"

"فنکار! مجسّمے کو دیکھ کر اس کے بے جان ہونے کا شک تک نہیں ہونا چاہیے۔ بس ایسا ہو جیسے مائیکل اینجلو کا ڈیوڈ۔"

○ ○ ○

"کام شروع کیوں نہیں کیا —؟"

"کل سے کروگے؟ مذاق کی بھی حد ہوتی ہے۔ دیکھو میں بہت سنجیدہ ہوں۔ اوہو —! اب آئی بات سمجھ میں۔ تم بھی پیسے کے پرستار ہو — آرٹسٹ ہو کر بھی بھوکے —!! ارے لعنت ہے ایسی فنکاری پر جو صرف پیٹ بھرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ یہ لو۔ ایک ہزار روپے۔ باقی بعد میں دے دوں گی۔ بس اب دو تین دن میں تیار ہو جانا چاہیے۔"

"جی ہاں۔ ٹھیک سمجھا۔ بہت جلدی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری ماں بھیا کو دیکھنے سے قبل ہی دم توڑ دے۔"

"نہیں۔ ضعیف کچھ نہیں۔ کینسر ہو گیا ہے۔ ڈیڈی کی اچانک موت اور میری شادی کے التوا، نے انھیں موت کی طرف دو چار قدم اور دھکیل دیا ہے۔"

"کیا — انہیں مجھ سے ہمدردی ہے؟ پھر تو میں تم سے بھی نفرت کرنے لگوں گی۔ کیونکہ یہ ہمدردی بڑی دوغلی چیز ہے؛ جو بھی شخص، اپنے دل میں اس کی ہلکی سی رمق بھی محسوس کرتا ہے، بڑا دوغلا ہو جاتا ہے۔ فنکار! میری نظر میں ہمدردی ایک ایسی گاڑی کا نام ہے جس کے آگے پیچھے دونوں جانب انجن

لگے ہیں —— اور دونوں کے رُخ باہر کی سمت ہیں —— مجھے اس کا تجربہ ہے کیونکہ میرا منگیتر اشفاق بھی اسی گاڑی کا سوار رہے۔ مجھے اُس سے ہرگز کوئی شکایت نہیں کہ وہ اُس گاڑی کی اسٹیرنگ سنبھال نہ سکا۔"

"جی ہاں۔ آج کل وہ ایک شادی شدہ عورت کے چکر میں ہے۔ ٹھیک ہی تو کیا ہے۔ کیونکہ میں تو اس پیار و پیار کے معاملے میں بڑی اناڑی ثابت ہوئی۔ مگر... اب نہیں ہوں۔ اب تو میں نے دنیا داری، بے ایمانی، خود غرضی سب کچھ سیکھ لی ہے۔ اب اگر میں کسی سے پیار کروں تو کامیاب ہو سکتی ہوں۔ یہی نہیں بلکہ بنا جہیز کے شادی کے حالات پیدا کر سکتی ہوں۔"

"کیا پوچھا —— ؟ نہیں نہیں۔ وہ اب بھی مجھ سے شادی کرنے سے انکار نہیں کرتا۔ ارے توبہ! اشفاق کے سینے میں انسان کا دل دھڑک رہا ہے۔ وہ اتنا سیدھا صاف کیسے انکار کر سکتا ہے۔ وہ تو آج کے دور کا ایک کامیاب مرد ہے۔"

"جی ہاں۔ وہ اب بھی راضی ہے۔ مگر... ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ کوئی بھائی ہونا چاہیئے۔ ٹھیک ہی سوچتا ہے۔ ایک بے سہارا ماں کی بیٹی شادی کے بعد پوری طرح ایمان دار بیوی اور بہو نہیں بن سکتی۔ کچھ کچھ بیٹی بھی رہ جاتی ہے جو سسرال والوں کے لیے انتہائی تکلیف دہ ہے"

"ارے —— تم کیسے فنکار ہو جی —— ! اپنے احساس پر ذرا بھی قابو نہیں۔ کبھی مسکرا دیتے ہو، تو کبھی پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتے ہو۔ کبھی میری باتوں کو نظر انداز کر کے دوسری طرف دیکھنے لگتے ہو۔"

"کیا! تمہیں میری نگاہوں کی برداشت نہیں۔"

"خوف ہوتا ہے —— ؟؟"

"یہ تم سچ نہیں کہتے فنکار! بڑی پیاری ہیں میری آنکھیں! بڑی بڑی چمکتی اور چھلکتی آنکھیں!! ہاں —— اب ان پر یاس و حسرت کے سایے پڑ گئے ہیں۔ پھر بھی تم تو فنکار ہو نا —— بے نقاب کر کے دیکھ لو۔"

ooo

"ارے تم —! اس دوا خانے میں —— ! تمہارا ابھی کوئی رہتا ہے کیا — ؟ یہ ..... یہ تم ہنسنے کیوں لگے — ؟"

"کیا — ! میرا چہرہ باگ کا چہرہ جیسا دکھائی دیتا ہے — ؟ ؟ نہیں تو۔ تمہاری نگاہوں کا دھوکا ہے۔ پچھلی رات باگ کا مجسمہ بناتے رہے کیا — ؟"

"اوہو ! پیلے دھبوں سے۔ ہاتھوں کا رنگ لگ گیا ہوگا۔ مجھے اپنا ہوش کہاں تھا — !"

"فنکار ! میری رہی سہی دنیا بھی لٹ گئی۔ میری ماں چل بسیں۔ ابھی کچھ گھنٹوں قبل۔ تب ہی تو رنگا تھا میں نے اپنے ہاتھوں کو۔ ماں کہتی تھیں جب تک میرے ہاتھ پیلے نہیں ہوتے ان کی روح جسم نہیں چھوڑے گی۔ حالانکہ جیتی زندگی کی ایک ایک سانس سو سو موت سے بدتر تھی۔ مگر ان کا خیال غلط نکلا —— یا پھر ممتا ان سے یوں کہلوا رہی تھی۔ موت تو وقت پر آہی جاتی ہے۔ مرتے دم تک انھیں یہی محرومی ستاتی رہی کہ میرے ہاتھ پیلے نہ ہو سکے۔ وہ تو خود سے پیلے نہ ہو سکے۔ مگر... جب ماں جانے لگیں تو میں نے خود اپنے ہاتھوں کو ہلدی میں ڈبو دیا — اور کیا کرتی۔ !"

"فنکار ! تم رو رہے ہو ؟ چھی چھی بسورنے مرد مجھے اچھے نہیں لگتے۔ یہ بتاؤ کتنا تیار ہوا ہے میرا بھیا — ؟"

"ٹھیک ہی تو ہے۔ آدھی ہی تو رقم دی ہے۔ اب رہنے دو۔ اُسے مکمل نہ کرو۔ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں۔"

"نہیں نہیں۔ مجھے اب کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ میں نے ماں کے جسم خاکی کو اسی دوا خانے کے عملے کے حوالے کر دیا ہے۔"

"..اچھا — اب چلتی ہوں۔"

○ ○ ○

اعجاز آرٹ گیلری بے ترتیب پڑی تھی۔ دو دن ہوئے کسی نے اعجاز کو کسی سے بات کرتے نہیں سنا تھا۔ آنکھیں ایک مقام پر ٹھہر گئی تھیں۔ ہونٹ شدتِ غم

سے یکساں لرزاں تھے اور انگلیاں سبک رفتاری سے پلاسٹر آف پیرس میں ہلچل
کر رہی تھیں۔ مسلسل دو راتوں سے وہ اُس ادھورے مجسمے کو مکمل کر رہا تھا۔ ساتھ
کام کرنے والے بار بار اسے ٹوک دیتے۔ مگر وہ تو احساس پروف بن گیا تھا۔
زندگی کی ہلچل سے بے نیاز۔ کوئی بات اُسے اپنے خیال سے باز نہ رکھ سکی۔
مجسمہ مکمل ہو گیا تھا۔
مگر۔۔۔ اس کا نچلا حصہ مرد کا تھا۔ اس کا اپنا —— اور اوپر کا حصہ عورت
کا تھا۔ گردن اور چہرہ عورت کا۔ شہلا کا چہرہ تھا۔ بھرے بھرے لرزاں ہونٹ،
خاموش جھیل جیسی بڑی بڑی آنکھیں، چھوٹی سی قدرے گول ناک۔ ٹھوڑی پر
کالا تل —— اور بکھرے ہوئے نیم گھنگھریالے دراز بال —— یہ تھا مجسمہ
—— ! شہلا کا مجسمہ —— !! ایک عورت کے نا تمام وجود کا مجسمہ !!!

یکم مارچ ۱۹۷۵ء

قمر جمالی

کھنڈر

دراصل یہ میرے ماں باپ کا آبائی وطن ہے جلال آباد۔ شاید چالیس سال بعد میں یہاں آیا ہوں۔ ویسے بچپن میں ہر سال گرما کی چھٹیاں یہیں گزاری جاتیں تھیں۔ وہ سنہرے دن وہ رنگین شامیں آج بھی یاد آتی ہیں تو گھڑی دو گھڑی کے لئے روح میں تراوٹ آجاتی ہے۔ مگر میں بھی اوروں کی طرح مجبور ہوں کیونکہ آج کے اس مشینی دور میں انسان کو اتنی فرصت کہاں کہ کم از کم تصورات کی دنیا آباد کر کے ماضی کے جھروکوں سے تاریخ کے اوراق الٹے۔ آج تاریخ کی کتابیں پڑھتا بھی کون ہے؟؟ حد تو یہ ہے کہ آج کے انسان کو اپنا شجرۂ نسب باپ کے باپ سے آگے ازبر بھی نہیں رہتا۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی جلال آباد کی جو میرے والدین کا آبائی وطن ہے۔ مگر بیچ میں بچپن کا تذکرہ آگیا جو میری کمزوری ہے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں بستر پر لیٹے لیٹے کئی بار خود کو جنم لیتا دیکھتا، پھر پاؤں پاؤں چلتا لڑکھڑاتا گرتا ــــ پھر جوان ہوتا۔ ۔ مگر نہیں جوانی کو یاد کر کے میں لوٹ کر پھر اُسی جگہ آجاتا جہاں آج پڑا ہوں۔ ایک بڑے مکان کے فاضل کمرے میں کسی ایسے پرانے سامان کی طرح جس کے پہلو جگہ جگہ سے چیک گئے ہوں، جس کا روغن جگہ جگہ سے اکھڑ گیا ہو ــــ اور۔ ۔ جس کے صدر دالان میں دکھائی دینے سے زندگی کا سارا رنگِ زیبائش مسخ ہو جاتا ہو۔

اب میں ساٹھ برس کا ہوگیا ہوں۔ ویسے بھی میں خود کو ناکارہ سمجھتا ہوں۔ مگر میرے تصور کی سیما میرے اپنے اقدار کی قائم کی ہوئی ہے کیونکہ اس سیما کے اندر میرے بیٹے کے موٹر گیراج کے پیچھے والا وہ کمرہ تو میں نے کبھی دیکھا ہی نہ تھا جس میں مَیں آج کسی ٹوٹے ہوئے ٹائر کی طرح پڑا ہوں۔ کیونکہ حویلی نما اس مکان کے سارے کے سارے کمرے ضروری اور اشد ضروری اشیاء کے لئے مختص ہیں۔

زندگی: تو وہی ہے۔ اب اسے بلاوجہ کاہے کو دوش دیں کیونکہ وہی تو ایک مخلص دوست ہے جسے ہم اپنی مرضی کے مطابق گھیٹتے پھرتے ہیں، نرم و ملائم سبزہ زاروں پر، سخت نکیلے ریگزاروں پر۔ کبھی اس نے ساتھ دینے سے انکار نہیں کیا۔ ہاں کبھی کبھی حالات کی عیاری کی وہ بھی شکار ہو جاتی ہے۔ اور آج کی دنیا نے اس پر صرف ضرورت کا لیپ چڑھا دیا ہے۔ کھانے کی ضرورت، پانی کی ضرورت، نہانے کی ضرورت پہننے کی ضرورت، دکھائی دینے کی ضرورت نہ دکھائی دینے کی ضرورت۔ غرض ضروریات نے زندگی کے چہرے کو اطراف سے لپیٹ کر اس کی شکل ہی مسخ کر دی۔ میں اسی مسخ شدہ زندگی کو نہلا دھلا کر اس کے اصلی روپ میں دیکھنے کے لئے جلال آباد آیا ہوں جہاں میں نے اپنی زندگی کے خوب صورت دن گزارے تھے۔ یعنی اپنا بچپن۔

مگر۔ ۔ ۔ آج چالیس برس بعد گاؤں آکر میں سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ کیا یہاں کبھی جیتے جاگتے انسان رہتے تھے ــــ کیا یہی وہ گاؤں ہے جہاں زندگی اپنی پوری چنچلتا کے ساتھ دندناتی پھرتی تھی۔ وہ نغمگیں صبحیں، وہ سنہری شامیں جن کے سایے میں زندگی زعفرانی لباس میں، سیم تن، نازک قدم، پازیب کی شورش اور آنچل کی سحر آگیں فضا لئے گاؤں کی آبادی سے گزر کر درگاہِ سید جلال بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے سے گزرتی تو اس کی ہم عمر ہمعصر لڑکے اس شوخ کے آنچل کو چھونے اس کے پیچھے پیچھے دوڑتے ہوئے املی بن تک نکل جاتے۔ تب انھیں احساس ہوتا کہ زندگی نے تو اپنا زعفرانی ڈوپٹا کبھی کا کھینچ پھینکا اور سرمئی ردا اوڑھ لی۔ وہ شورش، وہ شوخی جھینپ میں بدل جاتی اور پھر گاؤں واپس لوٹتے ہوئے جانوروں کے ریوڑ کے ساتھ وہ سب بھی لوٹ آتے۔ یہ وہی جلال آباد ہے جہاں زندگی جینے کے لیے نہیں ۔ ۔ ۔ زندگی کا ایک خوب صورت محل تعمیر کرنے کے سپنے دیکھے جاتے ــــ!! یا پھر ۔ ۔ ۔ میں شاید کسی اور جگہ آگیا ہوں۔

یہ مکانات ۔ ۔ ۔ نہیں نہیں انھیں مکانات کیسے کہیں۔ ان کی دیواروں سے

پلستر ایسے غائب ہیں جیسے بھوک کی تاب نہ لاکر ان کے مکینوں ہی نے انھیں کھرچ کر چاٹ لیا ہو۔ اور اب جو باقی بچا ہے وہ انھیں چاٹنے کے اہل نہ رہے ہوں۔

"سلام بڑے میاں"۔ میں اُس وقت چونکا جب کسی نے میرے ماموں میاں کو بڑے ادب سے سلام کیا۔

میرے نانا اِس گاؤں کے زمیندار تھے۔ ہمارا گھرانہ بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا۔ اب اس گاؤں میں ہمارے گھرانے کی نشانی صرف ہمارے ماموں میاں تھے جنھوں نے ہزار کوشش کے باوجود گاؤں نہیں چھوڑا تھا۔ انھیں اس حویلی کی دیواروں سے پتا نہیں کیسا عشق تھا۔ سردی گرمی برسات ہر موسم کی سختیاں تنہا یہاں رہ کر جھیل رہے تھے۔ اگرچہ کہ ان کی اولاد شہر میں بڑے عیش کی زندگی گزار رہی تھی اور انھیں ماموں میاں کو پالنے میں کوئی قباحت نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ تنہا عشرت بھیا ہی کا اتنا بڑا کاروبار ہے کہ اُن کے گھر کے کتوں پر بھی ماموں میاں کی نگہداشت سے زیادہ خرچ آتا ہو گا۔

"بیٹا۔ یہ مھیدین ہے پہچانا ــــ؟" ماموں میاں نے کہا۔

بہت یاد کرنے پر یاد آیا، ہمارے ساتھ پگڈنڈی پگڈنڈی دوڑنے والا ــــ سال میں ایک بار ان انجان راہوں پر ہمارا گائیڈ محی الدین۔ گاؤں والے تب بھی اس کا نام بگاڑ کر اُسے مھیدین ہی پکارتے تھے اور آج بھی جب کہ زمانہ اتنا آگے بڑھ گیا ہے۔

"ام ــــ تو تم مھیدین ہی رہ گئے ــــ محی الدین نہ بن سکے ــ ا پہچانا مجھے ــ؟"

محی الدین اپنی آنکھوں کو پورا سمیٹ کر مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ماضی کے محی الدین میں اور مجھ میں بس ایک قرن کا فرق رہا ہو گا۔ مگر آج ۔ ۔ ۔ آج یہ تفاوت ایک صدی سے بھی زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ جب تک محی الدین مجھے پہچان لیتا، اس کی طاقت برابر کرنے کے لئے اُسے گلوکوز کی پوری ایک بوتل چڑھانی پڑے گی۔ نقاہت کی یہ شکل میرے تصور سے باہر تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ آج ہمارے بڑے شہروں کے طبی کالجوں میں کمزوری و نقاہت کی صحیح شکل سمجھنے کے لئے طالب علموں کو اپنے تصورات کو زحمت دینی ہوتی ہے۔ اگر ایک بار وہ کسی دیہات کی طرف نکل جائیں تو دیکھیں گے کہ بھوک اور افلاس کے مارے انسان نقاہت کی کس حد کو پہنچ چکے ہیں کہ اگر موت بھی ان کے سامنے مجسم ہو جائے تو وہ پہچان نہ سکیں اور اپنی آنکھوں کے کنارے سکوڑ ے، اپنے لاغر اور سوکھے ہاتھ جوڑے

کہہ اُٹھیں —— "بس ایک روٹی مل جاتی ——!"

بیٹا، یہ علی وجہی ہے۔ شاکرہ بی بی کا بڑا لڑکا۔" آخر ماموں میاں ہی نے اُس کی مشکل آسان کر دی۔

علّو جی ——!! مارے خوشی کے اس نے اتنی زور کی ہانک لگائی کہ میں تو سمجھا کہ زمین کا بوجھ ہلکا ہوا۔ لیکن نہیں وہ تو جوں کا توں کھڑا رہا۔ ہاں مگر اُس کا پیکر بیدِ مجنوں کی طرح کانپنے لگا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے آگے جوڑ رکھے تھے، اور اُس کی آنکھوں سے یادوں کا ایک قافلہ رواں تھا۔ اُس کے ہونٹوں کے کنارے یوں لرزاں تھے جیسے یادوں سے نکلنے والے اس قافلے کو مہمیز لگا رہے ہوں —— اس کی لرزتی پلکوں کے نیچے ایک طوفان بپا تھا۔ فرطِ انبساط سے مغلوب ہو کر وہ مجھ سے لپٹ نہیں سکتا تھا کیونکہ میں اس گاؤں کے زمیندار کا نواسا تھا اور وہ ہمارے ایک بیگار کی اولاد۔

اب محی الدین رو نہیں رہا تھا۔ ہچکیاں لے رہا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہی منحنی شخصیت، سُتا ہوا چہرہ، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اور اس پر موٹے شیشے کی عینک۔ سر پر زرد پگڑی جس کا وزن اس کے سارے جسم سے بھاری تھا۔ اب تو پگڑی کا یہ زرد رنگ اس کی رنگت میں سما گیا تھا۔

میں دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے ایک زرد نہر بہہ رہی تھی اور اُس زرد نہر کے دونوں بازو رخساروں کے استخوانی ساحلوں پر ایک تماشا ہو رہا تھا۔ یادوں کا ایک ہجوم اُمنڈا چلا آ رہا تھا۔ اور یادیں —— قطرہ قطرہ گاؤں کی پگڈنڈیوں سے ہوتی ہوئی لہلہاتے کھیتوں سے گزر رہی تھیں۔ شاید ان ہی دنوں کی بات رہی ہو گی۔ یہی کارتی تھی اشوفی۔ سبز و خنک ہواؤں کی مہک، باجوں گاجوں کے بیچ محی الدین کا وہ سمٹ سمٹ کر چوکی پر بیٹھنا اور ہم لوگوں کا اسے چھیڑنا۔ مگر اُس دن ہلدی میں لت پت ہو کر بھی محی الدین کی رنگت یوں زرد نہ لگی تھی۔

جیسے جیسے ہم یار باش اُسے چھیڑنے لگتے، ہلدی کی تہہ کے پیچھے سے بھی اس کے رخسار سیب کی طرح سرخ ہو جاتے تھے۔ مگر اُس وقت ——؟ ہاں مذاق تو ہم کر ہی رہے تھے مگر اس وقت کسی یار نے اُس کے کان میں پتا نہیں کیا کہا کہ محی الدین چوکی چھوڑ کر بھاگا۔ بڑی بوڑھیوں نے سمجھایا، منایا کہ یوں، مانجھے کی چوکی سے اٹھنا بدشگونی ہے۔ مگر محی الدین نے تو وہ قسم کھائی کہ پھر لوٹ کر چوکی پر نہ آیا۔ اُس رات ہماری بھی خوب پٹائی ہوئی کہ ہماری چھچھوری حرکتوں سے محی الدین نے چوکی چھوڑی۔ اس رات ہم نے بھی قسم کھائی کہ اب چاہے جتنے دن محی الدین مایوں

بیٹھا رہے ہم اُس سے ملیں گے تو بس لال پگڑی ہیں۔

سُنا کہ رات بھر رت جگا رہا۔ گلگلے ملیدہ بنا۔ سب سے پہلی سینی تو ہمارے ہی گھر آئی سینی بڑی خوب صورتی سے سجائی گئی تھی۔ سفید ملیدے پر رنگین چوبے کے بیل ڈورے، بیچوں بیچ چاندی کے ورق میں لپٹے بادام کاجو کے پھول بوٹے، اطراف سے اصلی گھی کا ڈورا۔ مگر قسم ہے جو جو ہم نے ذرا بھی منھ سے لگایا۔ ہمارے حصے کا ملیدہ اور گلگلے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ہمیں بھی تاؤ آ گیا تھا کہ آخر اس محی الدین کے بچے کو عورتوں کی طرح شرمانے کی کیا ضرورت تھی ــــ! نہ وہ شرما کر چوکی سے اٹھتا، نہ نانا جان کے ڈنڈے ہماری پیٹھ پر پڑتے۔

اُس دن: ابھی مرغ نے بانگ بھی نہ دی تھی کہ ہم ہمارے دوست املی بن میں جا چھپے کہ جب دولھا کی گھوڑی گشت کرتی ہوئی وہاں سے گزرے تو اُسے بدکا یا جائے۔ پروگرام کے مطابق دھوپ چڑھنے سے پیشتر بارات کو املی بن سے گزر جانا چاہیئے تھا۔ سورج سر پر چڑھ آیا تھا مگر بارات کا کہیں پتا نہ تھا۔ ہم سب بےچین تھے کہ یکایک گاؤں کی طرف چیخ پکار کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ہم سب دوڑے دوڑے محی الدین کے مکان پہنچے۔ وہاں ایک افراتفری پھیلی دیکھی۔ ہر آدمی بدحواس دولھن کے مکان کی طرف بھاگتا نظر آیا۔ ہم سب بھی ہجوم کے پیچھے دولھن کے مکان پہنچے۔ وہاں ہم نے جو دیکھا شاید اُسی کو قیامت کہیں گے۔

شادی کا گھر کھچا کھچ بھرا ضرور تھا۔ مگر شادمانی کی جگہ اب آہ و بکا نے لی تھی۔ دولھن شرم و حیا کی گٹھڑی بنی سمٹی سمٹائی بیٹھی نہیں تھی۔ بلکہ زعفرانی ڈوپٹا اوڑھے بڑے آرام سے سو رہی تھی۔

"ہائے زُہرہ ــــ موئے مھیدین کے جلے نصیبوں نے تجھے سانپ بن کے ڈس لیا۔ ہائے میری بچی!"

دولھن کی نانی سینے پر ہتھڑ مار کر رو رہی تھیں۔ ہم نے پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ زُہرہ کو کالے ناگ نے ڈس لیا جو پھولوں کی ٹوکری میں بیٹھا ضلع سے بس میں سفر کر کے مھیدین کو زندہ درگور کرنے آیا تھا۔

پھر جو دولھن کو نہلانے کا وقت آیا ایک غوغا اُٹھا کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ ہر آدمی سینہ کوبی کرتا تھا۔ ابھی دولھن کو مہندی کے تخت سے اٹھایا ہی جا رہا تھا کہ مھیدین ریگستان کی آندھی کی طرح اندر گھس آیا اور دولھن پر اُڑھایا ہوا زرد ڈوپٹا گھسیٹا اور یہ جا وہ جا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے

ہوا یہ کہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ لوگ حیرت سے بت بنے دیکھتے رہے۔

کئی مہینوں تک محی الدین کی کوئی خبر نہ ملی۔ پھر سنا کہ دو ایک سال بعد وہ لوٹ آیا، مگر زردی اُس کی رگ رگ میں سرایت کر چکی تھی۔ شادی کے نام سے جو زرد انقلاب محی الدین کی زندگی میں آیا وہ آج بھی اس کے سر پر پگڑی کی شکل میں موجود تھا۔ ہاں اب اس کی رنگت نے کچھ زیادہ ہی اُس رنگ کو قبول کر لیا تھا۔

"بیٹا وجہی — تم کہاں کھو گئے ——؟"

بھلا ہو ماموں میاں کا انھوں نے ٹھوکا دیا۔ کیونکہ میں یادوں کے اُس قافلے کو افق کے پار اترتا دیکھتا رہا مگر گردِ کارواں نے محی الدین کی آنکھوں میں جو چبھن چھوڑی وہ تو میں دیکھنا ہی بھول گیا۔ کیسا کرب ابھر آیا تھا محی الدین کے چہرے پر —! خدایا — یہ چہرہ ہے یا یادوں کا قبرستان!!

میں نے سوچا۔

"اللہ اکبر ——" قریب درگاہ شریف سے ملحق مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ ماموں میاں اپنے سر پر ٹوپی درست کرتے ہوئے کہنے لگے . . . . .

"میاں۔ حویلی کے صدر دروازے تک تو پہنچ چکے۔ اپنا بکس محی الدین کو دے دو۔ وہ نہیں لے جائے گا۔ آج جمعہ ہے نا"

"لائیے علوجی ——" محی الدین نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

"کیا ——!" میں چونکا۔

"وزن میں اُٹھاؤں گا۔" محی الدین نے کہا۔

"تم یہ سوٹ کیس اُٹھاؤ گے ——؟" میری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ میری دانست میں تو یہی بات بڑی تعجب خیز تھی کہ وہ خود اپنا بوجھ کیسے سنبھال لیتا ہے۔ میں نے مسکرا کر اس کے چہرے کی گرد پونچھی عینک درست کر کے اُس کی ناک پر چڑھائی اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اپنے گھر کی طرف بڑھا۔ پہلے محی الدین کسمسایا، سہما سہما اپنے اطراف کا جائزہ لیا اور پھر ٹھیک ہو گیا۔ مکان کے اندر پہنچتے پہنچتے وہ بالکل پھرتیلا ہو گیا تھا۔ اندر پہنچ کر اس نے میرا سامان ایک جگہ قرینے سے رکھا۔ بڑی بی کو جو غالباً ماموں میاں کا باورچی خانہ چلاتی تھیں انھیں کچھ ہدایتیں کیں اور پھر تانبے کا ایک بڑا سا آفتابہ اور سیلابچی لے آیا۔

"لو میاں۔ وضو کر لو۔ جماعت کھڑی ہو جائے گی"

"میں اس میں وضو کروں ۔ ! نہیں ۔ ۔ یہ نہیں ہو سکتا" مگر وہ بھی مُصر تھا۔ آفتابہ اپنے ہاتھ میں لئے کھڑا رہا۔ اب میں بھی مجبور ہو گیا تھا۔ کیونکہ جماعت کے شروع ہونے کا مجھے بھی احساس ہو رہا تھا۔

مسجد جاتے ہوئے راستے میں جو بھی دروازہ ملتا محی الدین اس کی تفصیل سناتا کہ کیسے لوگ بے وطن ہو گئے۔ کیسے سارا گاؤں کھنڈر بن گیا۔

"یہ شہاب الدین کا مکان ہے۔ ان کے تمام لڑکے عرب ممالک چلے گئے۔ کبھی کبھی آتے بھی تھے۔ مگر پچھلے چار سال میں خدا نے انھیں توفیق نہ دی اور دونوں میاں بیوی اپنے لڑکوں سے ملنے کی خواہش لیئے اس دنیا سے سدھارے

"یہ سر سار یڈی کا مکان ہے۔ اس کے سارے لڑکے بیروت میں کام کرتے ہیں"

باتیں کرتے کرتے مسجد پہنچ گئے۔

شام چائے کے بعد میں اور محی الدین گاؤں پھر کر دیکھتے رہے۔ گھومتے گھومتے چوپال پہنچے۔ وہاں بھی وہی سناٹا ۔ ۔ وہی خاموشی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ دنیا کی یہ کون رسم ہے کہ جہاں پیر رکھنے کو جگہ نہ ہو، آدمی اسی میں پیر سمیٹ کر سمانے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ خود کو سمیٹتے سمیٹتے اس کا اپنا قد بھی گھٹ گیا ہے۔ کتنی زمین ہے جو ابھی دیہاتوں میں بنجر پڑی ہے ــــ اور کتنے گھر ہیں جو بے مکین کھنڈر ہیں ـــــ!!

"اب یہاں کوئی نہیں آتا" میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ محی الدین تاڑ گیا، اور اپنی بات کو جاری رکھتا ہوا گویا ہوا ـــــ "برتن ہوں گے تو آپس میں ٹکرائیں گے بھی، اور ٹوٹیں گے بھی۔ لوگ ہوں گے تو جینے کی دوڑ میں حصہ بھی لیں گے ـــــ گریں گے بھی۔ اور سبقت لے جانے کی چکر میں ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچیں گے بھی۔ اب یہاں نہ لڑائیاں ہوتی ہیں ـــــ اور نہ تحصیلدار چاوڑی میں بیٹھا فیصلے سناتا ہے ـــــ اور ۔ ۔ ۔ نہ چوپال پہ بیٹھے لوگ شام کے وقت ان مقدموں پر تنقید و تبصرے کرتے ہیں"

محی الدین کی زبانی اتنی لمبی چوڑی تقریر سُن کر میں سناٹے میں آگیا۔

"پھر ـــــ یہ مکانات ـــــ یہ بند دروازے ـــــ ! اکھاڑ کیوں نہیں پھینکتے انھیں۔ بند دروازوں کے پیچھے سے یہ دیواریں کتنی ہولناک کہانیاں سناتی ہیں ۔ !! دروازے اکھاڑ دو۔ دیواریں گرا دو۔ کم از کم یہ گاؤں کھنڈر کی مثال آثارِ قدیمہ کے ریکارڈ میں تو زندہ رہے گا ـــــ !

"تم چپ رہو جی علوجی ــــ" محی الدین نے اس بری طرح مجھے چپ کرایا کہ میں سناٹے میں آگیا۔ مگر دوسرے لمحے محی الدین کو اپنے پیروں پہ گرا ہوا پایا تو۔ بچپن کی ہزاروں کہانیاں پاؤں چلتے بچوں کی طرح گرتی پڑتی ، ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتی میری نگاہوں کے سامنے سے گزرنے لگیں۔ جذبات میں بہہ کر میں نے دیکھا ہی نہیں کہ میری باتوں نے محی الدین کے چہرے سے کتنی زندگی چھین لی ۔ یہ محی الدین کی پرانی عادت تھی کہ جب بھی اُسے میری کوئی بات ناگوار گزرتی وہ اسی لمحے ہوئے انداز میں مجھے جھڑک دیتا ــــ "تم چپ رہو جی علوجی" اور پھر خود ہی اپنی غلطی کو محسوس کر کے پیروں پر گر جاتا اور معافی مانگتا ۔

آج بھی اتنے برس بعد ــــ محی الدین بالکل نہیں بدلا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر اپنے برابر بیٹھایا ، ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ اتنے میں پتا نہیں کیا بات ہوئی کہ محی الدین مجھے وہیں بیٹھا چھوڑ کر دوڑتا ہوا گاؤں کے مکھیا کے پاس گیا اور اردو اخبار اٹھا لایا۔ بس اس دن سے یہ معمول بن گیا کہ شام کی چائے کے بعد ہم دونوں چوپال پہنچتے ، محی الدین اخبار لے آتا اور میں اسے سرخیاں پڑھ پڑھ کر سناتا ۔ میں نے محسوس کیا کہ محی الدین کویت اعراق جنگ کی خبروں میں حد درجہ دل چسپی لیتا ہے۔ جب تک ساری خبریں نہ سن لیتا کسی چھوٹے بچے کی طرح میرے بازو اکڑوں بیٹھ جاتا جیسے میں اخبار نہیں پڑھ رہا بلکہ سامنے دودھ پیڑے رکھے فاتحہ پڑھ رہا ہوں اور وہ ــــ ننھے سے بچے کی طرح بے صبری سے بار بار ٹھوکا دے رہا ہے۔ "فاتحہ چھوٹی پڑھو"۔

چوپال سے حویلی پہنچتے ہوئے وہ بس ایک ہی سوال کی گردان کیے جاتا کہ اب یہ لٹے پٹے لوگ جو ساری جوانی داؤ پر لگا کر بس اپنی جان مٹھی میں دبائے لوٹ رہے ہیں تو ان کا کیا ہوگا ــــ ! ؟ کبھی تاؤ میں آجاتا تو کہتا" ان غداروں کے ساتھ یہی تو ہونا تھا۔ جوانی کا سارا پسینہ دیار غیر میں جذب ہونے دیا۔ اب جو سر چھپانے پہ بن آئی تو مادر وطن کا آنچل ہی ملا نا ــــ ؟"

پھر بڑی دیر تک کڑ کڑ اتا رہتا۔ کبھی بیرون ملک کام کرنے والوں کو گالیاں دیتا۔ کبھی ترس کھاتا۔ مجھے یہ سب سن کر بڑا مزہ آتا اور شاید مجھے اس کی عادت ہو گئی تھی۔ کبھی وہ چپ ہو بھی جاتا تو میں ہی اُسے چھیڑ دیتا۔

۔ ۔ ۔ مگر اُس دن اسے بڑا تاؤ آگیا تھا۔ وہ بلاوجہ ہی گاؤں کے نوجوانوں

کو کوسنے دے رہا تھا کہ کس طرح انھوں نے زندہ سلامت گاؤں کو کھنڈر بنا دیا۔

"صبح کا بھولا اگر شام گھر لوٹے تو اسے بھولا نہیں کہتے محی الدین۔ یہ لوگ قسمت کے ستائے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ ہمدردی روا رکھنی چاہیے۔ ابھی دیکھو ہماری حکومت نے کیسے بڑھ کے ان کے لڑکھڑاتے قدموں کو سہارا دیا ہے۔ انھیں طرح طرح کے قرضہ جات منظور کیے جا رہے ہیں۔ اور تو اور شہر کی کچھ سرکردہ شخصیتوں نے مل کر ایک ٹرسٹ قائم کیا ہے۔ جہاں امداد کے ذریعہ جمع کی گئی رقم ان مظلوموں میں بطورِ قرضہ حسنہ تقسیم کی جائے گی۔"

"تم نے بھی اس میں اپنا حق ادا کیا ہوگا علو جی ——— ؟" اس نے پوچھا مگر جواب کا انتظار کیے بغیر میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا حویلی پہنچا۔ اُس دن وہ بڑا مطمئن نظر آتا تھا۔ اس دن کے بعد میں نے اس کے چہرے پر بیرونِ ملک کام کرنے والوں کے خلاف نفرت نہیں دیکھی۔ اگر کبھی میں ہی کچھ کہہ جاتا تو وہ جھڑک دیتا ——

"تم چپ رہو جی علو جی ——" پھر پاؤں پہ گرتا اور ہاتھ جوڑ کے کہتا۔

"صبح کا بھولا اگر شام گھر لوٹے تو اسے بھولا نہیں کہتے ۔"

مجھے یہاں آئے پورے پندرہ دن ہو چکے تھے۔ ان پندرہ دنوں میں جہاں میں نے ہر دن تقریباً دو گھنٹے ماموں میاں کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے راضی کرنے میں صرف کیے تھے وہیں ایک آدھ گھنٹہ محی الدین کو منانے میں بھی۔ میں گاؤں کے سناٹے اور ہولناکی سے اس قدر پریشان تھا کہ اکثر سوچا کرتا جہاں کسی کی موت کی اطلاع ملی کہ ماموں میاں اور محی الدین کے پیروں میں چکریاں لگ جاتی ہیں۔ اگر جو کبھی انھیں کے ساتھ یہ حادثہ ہوا —— ؟ ؟ اس کے آگے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ خدا خدا کر کے ماموں میاں تو راضی ہو گئے فی الحال عارضی طور پر ہی سہی مگر محی الدین اپنی ضد پر اڑا رہا۔

"حویلی کی ان دیواروں پر میرے بہت سے احسانات ہیں علو جی۔ کیا ان آخری ایام میں یہ مجھے سہارا نہ دے سکیں گی ——۔ اور پھر اب جب کہ میری زندگی کی گاڑی سیٹی دے چکی ہیں خود کو اس کھنڈر کے معماروں میں شامل ہونے نہ دوں گا۔ اور جیسا کہ آپ نے کہا جو کبھی آثارِ قدیمہ کے ریکارڈ میں اس گاؤں کا نام آگیا تو جیتوں کو وہی شہرِ خموشاں کی آبادی کو دیکھ کر تو اندازہ لگایا جائے گا کہ ۔ ۔ ۔ کبھی یہ کھنڈر کتنا آباد تھا ——!!!"

محی الدین نے میری باتوں کا غلط مطلب اخذ کیا تھا۔ مجھے افسوس ہوا مگر میں بھی کیا

کرتا، میرے سینے میں دھڑکتے اس حساس دل نے مجھے مجبور کر رکھا تھا۔ میں اپنی کوشش میں ڈٹا رہا۔

ہماری حویلی کے مقابل ایک نہایت بوسیدہ سا مکان تھا جس کی دیواروں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ برسوں سے لمسِ انسانی کی لذت سے محروم ہیں۔ مگر ہر دن سرِ شام ایک بڑھیا ہاتھوں میں مٹی کا برتن لئے دیوار سے لگے چبوترے پر نمودار ہوتی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے وہ شام کا کھانا کھاتی اور مغرب کے ساتھ اندر چلی جاتی تو دوسری سہ پہر کو نمودار ہوتی۔ اس بڑھیا کی موجودگی کا احساس کر کے مجھے وہ مکان آباد کبھی نہ لگا بلکہ مزید پُراسرار ہی لگتا تھا۔ کبھی کبھی تو اس طرف نظر جاتی تو وہ دہشت ہونے لگتی جیسے وہ زندہ انسان نہیں بلکہ کوئی بدروح ہے۔ محی الدین نے بتایا کہ وہ کِشتما ہے۔ اور زندہ انسان ہے۔

اُس روز سرِ شام کِشتما چبوترے پر دکھائی نہ دی۔ مگر اس کے گھر میں بڑی رونق ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کی ساری آبادی سمٹ کر کِشتما کے کھنڈر میں جمع ہو گئی۔ نہ ذات نہ پات۔ سبھی دوڑے دوڑے کِشتما کے آخری سفر کی تیاریوں میں شامل رہے۔ اس دن محی الدین کے چہرے پر جو بشاشت اور زندگی دیکھی پھر کبھی نہ دیکھی۔ بڑا خوش تھا اور چہک چہک کر کہتا تھا۔

"تم نے دیکھا علوجی۔ وقتِ سفر کتنا خوب صورت ہوتا ہے — ! گاؤں میں کتنی آبادی ہو جاتی ہے — !"

"ہاں دیکھا تو ہے — اتنے تزک و اہتمام سے کسی کو رخصت کیا جاتا ہے — ! کِشتما کا وقتِ سفر دیکھ کر ہمیں مرنے کی خواہش ہوتی ہے۔"

"تم چپ رہو جی علوجی۔ زبان کڑوی نہ کرو۔"

محی الدین نے اس زور کی جھاڑ پلائی کہ میرے سر پر سوار جذبۂ شاعرانہ ہرن ہو گیا۔ مگر کِشتما کی موت سے مجھے ایک فائدہ ہوا۔ محی الدین عارضی طور پر ہی سہی ہمارے ساتھ شہر چلنے تیار ہو گیا۔ ہم لوگوں نے دوسری صبح ساڑھے دس بجے بس پکڑنے کا فیصلہ کیا۔

اس رات وہ سوتا نہ تھا۔ آدھی رات سے زیادہ ہو گئی مگر وہ یہاں وہاں کی ہانکتا رہا۔ ماموں میاں بھی کچھ دیر ہماری محفل میں شامل رہے پھر اپنی خواب گاہ میں چلے گئے۔ مگر محی الدین کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ نہ خود سوتا تھا اور نہ مجھے سونے دیتا تھا۔ پھر میں نے اصرار کیا کہ اب سو جانا چاہئے تو وہ مجبور ہو گیا۔ بادلِ نخواستہ اٹھا، کمرے سے باہر چلا گیا۔ پھر لوٹے

آیا۔ میں نے پوچھا بھی۔ اس نے کچھ بتایا نہیں۔ چپ چاپ کمرے سے نکل گیا۔ مگر۔ ۔ ۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ گیا نہیں بلکہ دروازے سے لگا کھڑا رہا۔ میں نے آواز دی، وہ اندر آگیا۔ ہزار پوچھا مگر کچھ بتاتا نہ تھا۔ وہ پھر مڑا۔ اس کے قدم اتنے وزنی ہو گئے تھے کہ اٹھتے نہ تھے۔ جیسے وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے پھر آواز دی۔ وہ پلٹ آیا۔

"تم ضرور یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم میرے ساتھ نہیں آسکتے۔ دیکھو محی الدین تم مستقلاً تھوڑے ہی گاؤں چھوڑ رہے ہو ـــ پسند نہ آیا۔ لوٹ آنا۔"

"یہ بات نہیں علو جی ـــ" اس کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔

میں نے روشنی بڑھائی۔ دیکھا اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔

"میں ہار گیا محی الدین۔ اب میں تمھیں مجبور نہیں کروں گا۔ ہاں جب کبھی تم محسوس کرو اور تنہائی کا احساس ہو چلے آنا۔ تم جانتے ہو میں نے ہمیشہ تمھیں اپنا دوست سمجھا ہے۔"

"یہ بات نہیں علو جی ـــ" پھر اس نے اپنی کمر ٹٹول کر ایک چھوٹی سی پوٹلی نکالی اور میرے ہاتھ پر رکھ دی۔

"یہ۔ ۔ ۔ میری زندگی بھر کی پونجی ہے ـــ" اُس کی آواز برابر نکلتی نہ تھی۔ دونوں ہاتھ جوڑے میرے آگے وہ دوزانو بیٹھ گیا۔

"نذرانہ ـــ! مجھے ـــ!! آج بھی تم اُسی دَور میں سانس لیتے ہو محی الدین۔ کیا تم مجھے آج بھی اُسی دَور کا زمیندار شمار کرتے ہو ـــ؟"

"نہیں علو جی۔ وہ بات نہیں۔ تم نے کہا نا شہر میں ایک امدادی ادارہ قائم ہے جو کو بہت سے لوٹے مظلوموں کی مالی مدد کرتا ہے۔ اس کی نذر کرنا۔ یہ میری زندگی بھر کی کمائی ہے۔ اور۔ ۔ ۔ اور یہ بات نہیں کہ میں تمہارے ساتھ نہیں آرہا ہوں۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ حقِ بندگی ادا کرنے کا یہی ایک راستہ نہیں کہ زمین کا حق ادا کر دو۔ یہ مٹی کی کایا ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے کہیں بھی دبا دو۔ پھر بھی جائے گی تو زمین ہی میں نا ـــ"

اُس نے بڑی مشکل سے اتنا کہا اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

میں نے گرہ در گرہ پوٹلی کھولی۔ محی الدین کی ساری عمر کی پونجی تھی چار سو اکتالیس روپے پچھتر پیسے۔ یکایک ہی کتنا قد آور ہو گیا تھا ننھی سا محی الدین ـــ! ساری رات میں بیٹھ نہ سکا۔ جیسے ہی زمین پہ ٹکنے کی کوشش کرتا محی الدین کا قد آور پیکر میرے آگے مجسم ہو جاتا

اور بارِ رعب کہ میں نہ تو بیٹھ سکا اور نہ لیٹ سکا۔

صبح فجر کی اذاں محی الدین کی آواز میں نہ آئی۔ کوئی اور اذاں دے رہا تھا۔ میں سوچا کہ ہو سکتا ہے صبح صبح اسے نیند لگ گئی ہو، حالانکہ یہ بات خلافِ معمول تھی۔ میں نے گھر ہی پر نماز ادا کی اور خود ہی اس کے مکان کی طرف چل پڑا۔ مگر۔ ۔ ۔ میں راستے سے لوٹ آیا کیونکہ اب اس کا کھنڈر آباد ہو گیا تھا۔

قمر جمالی

"ماتا بھوانی! مجھے شکتی دے، اور اُن سینکڑوں مزدوروں کو جو میرے ساتھ ہیں انھیں حوصلہ دے۔ یہ سچ ہے کہ میرے حوصلوں سے بندھی ان کی امیدیں اُن کی زبانوں پر تالا بن گئی ہیں مگر ___ مگر میں ان کی خاموش زبان جانتا ہوں۔ آج میٹنگ ہال میں ان کی سرد مہری اس بات کی گواہ ہے کہ اپنے بچوں کو بھوک سے تلملاتا ہوا دیکھ کر اب ان کے حوصلے ٹوٹنے لگے ہیں۔ ماتا۔ تو شکتی مان ہے ___ جو بھی تیری شرن میں خلوصِ دل سے آیا، تو نے اُسے بلوان بنا دیا ___ آج میں بھی تیری شرن میں آیا ہوں ___ صرف اپنی طرف سے نہیں ان سینکڑوں مزدوروں کی طرف سے بھی جو پچھلے دس دن سے انتظامیہ کے ہتھکنڈوں کے آگے فولادی دیوار بن گئے ہیں۔ ماتا ___ آج میں تجھ سے ایک ایسا شستر مانگنے آیا ہوں جو شاید کسی نے بھی تجھ سے کبھی نہ مانگا ہو۔ ماں۔ ہمیں ایسا ہتھیار دے جس سے ہم بھوک کو شکست دے سکیں۔ پھر ___ پھر دیکھتے ہیں یہ انتظامیہ ہمارا کیا بگاڑے گا۔ یہ تو بس اسی انتظار میں ہے کہ کب ہمارے پیٹ کی آنچ ہمارے دامنِ ضبط کو جلانا شروع کرے! ہمیں شکتی دے ماں کہ ہم بھوک پر قابو پا سکیں۔"

بھوانی شنکر ایک مزدور لیڈر تھا۔ پچھلے پندرہ دن سے وہ انتظامیہ کے خلاف لڑ رہا تھا۔ دس دن پہلے اس نے مزدوروں کی طرف

سے انتظامیہ کے خلاف ہڑتال کی نوٹس دے دی تھی۔ اس کی امید کے خلاف انتظامیہ بے حد سنگ دل نکلا مزدوروں میں اب بھوک سہنے کی تاب ٹوٹنے لگی تھی۔ ان کے جسم پر ابھرتی رگوں کا تانا بانا اور آنکھوں میں مایوسیوں کے سائے لہراتے دیکھ کر بھوانی شنکر کے حوصلے پست ہونے لگے تھے۔ اپنی بات ہوتی تو وہ چپ ہو جاتا۔ مگر یہ تو سینکڑوں مزدوروں کے مقدر کی بات تھی۔

وہ ایک نیک اور ایماندار مزدور لیڈر تھا۔ مزدوروں کے ساتھ مزدور بستی میں رہنے والا آزاد ہندوستان کی سوشلسٹ پالیسی کی چال پر اسے اتنا افسوس تھا کہ وہ سوچتا ہی رہ گیا کہ کیا یہی وہ آزاد ہندوستان کا حُلیہ ہے، جس کا خواب دیکھتے دیکھتے کئی عاشق دار پر چڑھ گئے۔ کب تک یہ کیپٹالسٹ (CAPITALIST) سوشلزم کے نام پر مزدوروں کے حقوق کا استحصال کرتے رہیں گے۔۔! اور۔۔۔ اُن کے خون پسینے سے اپنے محلوں کی مٹی گوندیں گے۔!!

اس سے پہلے بھی کئی بار اُس نے مزدوروں کو ان کے حق دلانے کی کوشش کی تھی مگر کچھ ہی دور چل کر خود مزدوروں ہی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ مگر اس بار اُس نے ان کے ارادوں میں اپنے حوصلے کا فولاد بھر دیا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہرگز انھیں پیچھے ہٹنے نہیں دے گا۔ کیونکہ اُسے اس بات کا پورا اندازہ تھا کہ مزدور، اگر ایماندار اور بلند حوصلہ ہو تو، ایک طاقتور اکائی بن سکتا ہے۔ انتظامیہ کا کوئی ہتھکنڈہ اس کے قدم ڈھیلے نہیں کر سکتا۔ مگر۔۔۔ مگر ایک بھوک ہے جو ابھی تھوڑی ہی دور چلا کہ اس کے قدم اکھاڑ دیتی ہے۔ اس کے ولولے سرد کرتی اور جوش توڑ دیتی ہے پارٹی آفس کے دفتر سے ہوتا ہوا وہ کالی مندر گیا، وہاں ماتا کے حضور ایک عجیب ہتھیار کی عرضی لگائی اور واپس اپنے مکان کے پچھواڑے کھٹیا پر بیٹھا وہ دن بھر کے گزرے لمحوں کو یکجا کر کے آئندہ کے لیئے لائحہ عمل مرتب کرتا رہا کہ یکایک کسی آواز پر وہ چونک پڑا۔

"کون ۔۔؟" پاس کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔

"میں ہوں۔ بھوک۔" ایک خفیف سی آواز آئی۔

"ہائیں۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں۔!" حیرت سے اُس کی عقل سلب ہونے لگی تھی۔

"ہاں۔ تم ٹھیک سن رہے ہو۔ میں بھوک ہوں۔"

بھوانی شنکر حیران تھا کیونکہ آج تک تو وہ صرف بھوک کو محسوس کرتا آرہا تھا۔ آج یہ کیا ہو گیا۔ ابھی تو وہ اسی کو شکست دینے کی بات سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ کیوں نہ آزمایا جائے۔ دو دو باتیں ہو جائیں۔

"اے بُو اُبھوک ــــ تم ہو یہاں ــ ؟" اس نے اپنا پیٹ پکڑ کر پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو ــ ؟"

"تم ــ تم یہاں کب آئیں ــ ؟" کیونکہ ناانصافیوں کے خلاف لڑتے لڑتے، اپنی مانگوں کو منوانے بھوک ہڑتال کرتے کرتے اُس کے پیٹ کی چمڑی اتنی سخت ہو گئی تھی کہ وہ سمجھتا تھا بھوک اُس کے پیٹ پر چٹکی بھی نہیں کاٹ سکتی۔ مگر۔۔۔۔ وہ تو بول بھا رہی تھی۔ وہ اپنی حیرانی دبا نہ سکا اور وہی سوال دہرایا۔

"یہ تو میرا گھر ہے۔ میرا آنا نہ آنا کیا ــ !" بھوانی کے سوال پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"پھر بھی۔ ابھی تک تو تم یہاں نہیں تھیں۔ پھر اچانک آئیں کہاں سے۔ ؟" اپنے پیٹ میں اٹھتی ہوئی جلن کو دباتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

"میں اسی بستی میں رہتی ہوں۔ پہلے بھی یہاں اکثر آیا جایا کرتی تھی۔ مگر جب سے مزدوروں نے ہڑتال شروع کی یہ بستی میرا مستقل ٹھکانہ بن گئی ہے۔ سچ پوچھو تو۔ آج کل یہاں کام بھی بہت رہتا ہے، اور مزہ بھی خوب آتا ہے۔" اُس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"کام ــ تم کام کیا کر سکتی ہو ــ ؟" بھوانی اپنی حیرت دبا نہ سکا۔

"مجھے تمہاری طرح قافلے بنانے کا شوق نہیں ہے۔ اپنی ذمہ داریاں میں اکیلی ہی بانٹتی ہوں۔ یہی دیکھو۔ میں ٹھہری اکیلی ــ اور اس بستی کا ہر پیٹ میرے ناز سہنے کے لئے اتاؤلا ہو رہا ہے۔ کبھی اس پیٹ میں تو کبھی اس پیٹ میں۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ دن رات کی دوڑ دھوپ سے میں نڈھال ہو گئی ہوں۔"

"خیر یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ مگر۔ تم تو کہہ رہی تھیں کہ تمہیں مزہ بھی آتا ہے۔ بتاؤ تو بھلا وہ کیسے ــ ؟"

"بھائی! مزہ میرے استقبال کا۔ میری مہمان نوازی کا۔ مان گئی اس بستی کے مسکینوں کو پچھلے دس دن سے وہ مجھے مہمان کئے ہوئے ہیں مگر کیا مجال جو ذرا اُن کے ماتھے پر شکن آئی ہو ــ وہی پُرسکون چہرہ ــ وہی ہمت اور وہی حوصلے۔ ایک وہ بھی بستی ہے جہاں ایک پل مجھے ٹھہرنے نہیں دیا جاتا۔ بس یوں گئی کہ یوں بڑھا دیا۔ نہ خاطر نہ تواضع۔ بس جاتے ہی وہ وہ ہتھیار استعمال کئے جاتے ہیں کہ ــ ہری ہری۔"

"کیا ہتھیار۔ تمہیں بھگانے کے لئے۔ !" اب تک بڑے انہماک سے وہ اُس کی لن ترانی

سنتا رہا ۔ مگر ہتھیار کا نام سنتے ہی وہ چونک پڑا ۔ یہی تو چاہیئے تھا اسے ۔ اور ابھی ابھی بھوانی ماں سے یہی تو مانگ کر آرہا تھا ۔

"بوا جی ۔۔۔ تم کچھ ہتھیار کے بارے میں کہہ رہی تھیں ۔ بتاؤ نا ۔"

"دال بھاجی تک تو معاملہ ٹھیک رہتا ہے ۔ مگر بریانی ، مٹن پلاؤ ، مرغ ، مچھلی ، کباب ۔ ان سب سے مجھے اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ گھنٹوں میں بے گھری ہو جاتی ہوں ۔ یہاں وہاں گھومتی پھرتی ہوں ۔ مگر ۔ ۔ ۔ میں کہاں نچلی بیٹھنے والی ۔ ! اس بار بدلہ لے کر اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کر لی انھیں وہ مزہ چکھایا کہ وہ بھی کیا یاد کریں گے ! !"

بُدلہ ۔۔۔ ! تم بدلہ کیسے لے سکتی ہو ۔۔۔ ! !" بھوک تو اس نے بہت دیکھی تھی مگر ایسی پٹر پٹر کرتی بھوک ابھی تک نہیں دیکھی تھی ۔ وہ حیران تھا کہ بھلا بھوک کسی کو مزہ کیا چکھا سکتی ہے ۔ !

"اے واہ ۔۔۔ نہیں تو کیا تم نے مجھے بے غیرت سمجھ رکھا ہے ۔ جب وہ لوگ میری آؤ بھگت نہیں کر سکتے تو میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ ان کے پاس ہرگز نہیں جاؤں گی ۔ اور ۔ ایک ہفتے سے نہیں گئی ۔"

" . . . تو اس سے انھیں کیا فرق پڑتا ہے ۔ اُلٹے ان کی تو عید ہو گئی ۔"

"عید ۔۔۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ " ذرا جا کر دیکھو کیسے خدا کی ہر نعمت سے محروم ہو گئے ہیں وہ ۔ ایک لقمہ کھانے کی حاجت نہیں رہی ۔ پیٹ خالی پڑے ہیں ۔ غش پر غش آرہے ہیں ۔۔۔ حکیموں ، ویدوں کی دکانوں کے چکر کاٹ رہے ہیں ۔" وہ پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگی ۔

بھوانی کا ماتھا ٹھنکا ۔ یہ تو ٹھیک کہتی ہے ۔ تبھی تو سیٹھ ہزاری مل اور سیٹھ بنواری لال کی موٹروں کو اس نے نرسنگ ہوم کے آگے پارک کیا ہوا دیکھا تھا ۔

اب بھوانی کو بھوک کی باتیں سمجھ میں آنے لگی تھیں ۔ مگر وہ اتنا میٹھا اور سچا بول رہی تھی کہ بھوانی شنکر نے بلا مقصد ہی اسے بولتا رکھنا ضروری سمجھا ، اور بات جاری رکھنے کے لئے نہایت بھدا سوال کر بیٹھا ۔

"بوا ۔ یہ بتاؤ تمہارا جنم کب ہوا اور اس دنیا میں تمہاری کیا ذمہ داریاں ہیں ؟"

"بھوانی ۔ ! تمھیں شاید نہیں معلوم ۔ میرا جنم تمہارے جنم سے پہلے ہوا ۔ جس طرح مکان بنانے والا پہلے نقشہ بناتا ہے اُسی طرح دنیا بنانے والے نے دنیا بنانے کے تصور کے ساتھ ہی مجھے بنا لیا ۔ اور جب انسان کی تخلیق ہوئی تو خدا نے مجھ سے پوچھا کہ بی بھوک ! تم انسان کے کس عضو

میں رہنا پسند کر دگی تو میں نے اُلٹا خدا سے سوال کیا کہ انسان کے جسم کا سب سے اہم عضو کون سا ہے؟ خدا سے جواب ملا کہ دماغ ایک ایسا عضو ہے جو سارے جسم پر حکومت کرتا ہے۔ تو میں نے انسان کے 'پیٹ' میں رہنے کی اجازت مانگی۔ اُس وقت میری عقلمندی پر خدا کو بھی ہنسی آگئی تھی۔ اور آج۔؟ تم دیکھ رہے ہو میں دماغ پر بھی حکومت کرتی ہوں۔ جب میں دماغ میں گھس جاتی ہوں تو تم جانتے ہو کیا ہونا ہے۔؟"

"نہیں ۔۔" بھوانی خود کو 'بھوک' کے آگے بے زبان محسوس کرنے لگا تھا۔

"دماغ بھوکا ہو جاتا ہے۔" اُس نے کہا۔

"ایں ۔۔ کہیں دماغ کو بھی بھوک لگتی ہے۔" پتا نہیں بھوانی یہ سوال بھوک ہی سے کرنا چاہتا تھا یا اُس کا خود کلامیہ تھا، مگر چونکہ بھوک اُس کا سوال سن چکی تھی اس لئے زور زور سے ہنسنے لگی۔

"بھوانی شنکر! تم ٹھہرے ایک سچے اور ایمان دار مزدور لیڈر۔ اس میں تمہارا قصور نہیں۔ تمہاری ایمان داری کا قصور ہے۔ تمہیں تو صرف پیٹ کی بھوک کا علم ہے۔ بھوک تو دل کو بھی ہوتی ہے۔ اور بھوک دماغ کی بھی ہوتی ہے۔ وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ایک مرتبہ ایک کروڑپتی نے مجھے پیٹ سے نکال کر دماغ میں رکھ لیا، تو وہ برداشت نہ کر سکا اور خودکشی کرلی۔ دراصل وہ ایک غریب آدمی تھا۔ جب میں اُس کے پیٹ میں تھی اُس نے سخت محنت کی اور خوب پیسہ کمایا۔ ایک ایسا وقت بھی آیا کہ اُسے میری پروا نہ رہی، مگر میں ۔۔؟ میں اپنی ذلت برداشت نہ کر سکی اور چپکے سے اُس کے دماغ میں جا گھسی۔ پھر کیا تھا جو بھوک اس کے پیٹ کو لگتی تھی اب وہ اُس کے دماغ کو لگنے لگی۔ روپیہ کمانے کے لئے اس نے وہ وہ گر آزمائے کہ اپنے اصولوں سے پھر گیا۔ پھر موت ہی نے اُسے میری چنگل سے آزاد کرایا۔

وہاں سے آزاد ہو کر میں ایک منچلے نوجوان کے دل میں گھس گئی اُس نے بھی میری بے عزتی کی تھی۔ جانتے ہو اس بھوک کا کیا نام ہے۔ اسے ہوس کہتے ہیں۔ بے چارہ عین شباب میں ایک چالیس سالہ خاتون کے عشق میں ایسا گرفتار ہوا کہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا۔ میں تو چپ سادھے اس کے دل میں بیٹھی رہی، مگر وہ اپنی تباہی برداشت نہ کر سکا، اور اس کا بھی وہی حشر ہوا جو اُس کروڑپتی کا ہوا تھا۔"

"بی بھوک۔ تمہاری کہانی تو بہت طویل ہو چکی ہے۔ کبھی ختم بھی ہو گی ۔۔" بھوانی اب بوریت محسوس کرنے لگا تھا۔

"میری کہانی اُس دن سے بھی پہلے شروع ہوئی تھی جس دن آدم اور حوا کو زمین پر پھینکا گیا تھا اور اس وقت تک چلتی رہے گی جب تک کہ سورج سَوا نیزے پر نہ آجائے سچ تو یہ ہے کہ دراصل اِس دنیا کی تخلیق کی حقیقی باعث تو میں ہوں۔ کیونکہ میں نہ ہوتی تو آدم "وزوجہ کل جنّتے کے معنٰی سمجھ نہ سکتے۔

بھوانی خاموش کھڑا اس کی باتیں سنتا رہا۔ اب بھوک نے بھی شاید محسوس کر لیا تھا کہ وہ بیزار ہونے لگا ہے۔

"کیوں تھک گئے بھوانی ـــ؟ صرف میرا آدھا چہرہ دیکھ کر ہی۔ ابھی تک تو تم تصویر کا صرف ایک ہی رخ دیکھتے رہے ہو۔ دوسرا نہیں دیکھو گے؟ برخوردار! اپنے آپ کو زندہ رکھنا چاہتے ہو تو ہمیشہ میری موجودگی کو محسوس کرتے رہو۔ کیوں کہ دنیا کی ہر ترقی میرے پاؤں سے لپٹی ہوئی ہے۔ میں نہ ہوتی تو جسم پر پتّے باندھے جنگل جنگل گھومنے والا انسان آج قیمتی پوشاکوں میں ملبوس نظر نہ آتا ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بڑھتی دنیا کے ساتھ ساتھ انسان اپنی عقل کے مطابق اس میں ردّو بدل کرتا آ رہا ہے۔ جیسا کہ لباس کہیں جسم کو ڈھانکنے کے لئے استعال ہوتا ہے تو کہیں جسم کی نمائش کے لئے۔ یہ اپنے اپنے سوچنے پر منحصر ہے۔ اب یہی دیکھو کچھ لوگ میری مہمان نوازی کے لئے سخت سے سخت محنت کر کے روٹی کماتے ہیں تو کچھ لوگ اپنی جسمانی خوب صورتی کو برقرار رکھنے کے لئے مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ سچ پوچھو تو انسان کی نرالی عقل اور سوچنے کے نت نئے انداز کے ساتھ دوڑتے دوڑتے میں تھک گئی ہوں۔ پہلے انسان اتنا چالباز نہیں تھا تو میرا ٹھکانہ بھی مستقل ہوا کرتا تھا میں نقلِ مقام کرتی بھی تو اس کی وجہ سمجھ میں آجاتی تھی۔ اب تو میں اس دور کے اِس پاگل حیوان کے ساتھ دوڑتے دوڑتے تھک گئی ہوں۔ میں عاجز آ گئی ہوں۔ ابھی کچھ دیر قبل جب تم بھوانی ماں سے مجھے مارنے کے لئے ہتھیار مانگ رہے تھے، تو میں نے بھی ماتا کو ہڑتال کی نوٹس دے دی ہے "۔

"ہائیں ـــ! ہڑتال کی نوٹس ـــ! تم نے دے دی۔! یہ تو بڑی اچھی بات ہے"۔

بھوانی کا انگ انگ جھوم اٹھا۔ یہی تو وہ چاہتا تھا۔ بھوک سے نجات۔ مارے خوشی کے وہ قہقہے مار کر ہنسنے لگا۔

"بُوا ـــ جلدی بتاؤ نا تم کب سے ہڑتال پر جا رہی ہو ـــ؟"

"بکواس بند کرو ـــ تم نرے بدھو ہو" بھوک کی زبانی اتنی زوردار جھاڑ کھا کر بھوانی شنکر کو وہ زمانہ یاد آ گیا جب وہ اپنی اماں کی گود میں بیٹھے بیٹھے ان کے کپڑے گیلے کر دیا کرتا تھا۔

"۔۔ تم ناراض کیوں ہوتی ہو بوا ۔۔ یہی تو مجھے چاہئے تھا کتنا اچھا ہوگا جب یہ جہنم پیٹ ہی نہ ہوگا۔"
"ہاں ہاں ۔ راشن پانی کا چکر ختم ضرور ہوگا ۔ مگر یہ تو سوچو تمہاری کٹیا کہاں سلامت رہے گی ۔"
بھوانی پیٹ اور کٹیا کا سمبندھ سمجھ نہ سکا ۔ ہونق کی طرح بڑی بڑی آنکھیں پھاڑے وہ بھوک کی طرف گھورتا رہا ۔
"برخوردار! ایک وہ بھی دن ہوگا جب یہ کٹیا ٹوٹ پھوٹ جائے گی ، اور اسے مرمت کی ضرورت پڑے گی۔"
"تو کون قیامت ٹوٹے گی ۔ پیٹ نہ ہوگا تو سارے پیسے پس انداز کر کے میں اس کٹیا کی جگہ ایک محل کھڑا کر دوں گا۔"
بھوانی کی بات سن کر بھوک بڑی دیر تک ہنستی رہی پھر کہنے لگی ، "مجھے انسان کی عقل پہ حیرت ہے ۔ اس نے اپنے اطراف دائرے کھینچنا ابھی تک ترک نہیں کیا ہے ۔ جب تک انسان خود کو قید کرنے کی عادت سے آزاد نہیں ہوگا ، وہ مجھ پہ تو کیا اپنی خودی پر بھی غالب نہیں آسکتا ۔ عزیزم! یہ میں ہی ہوں جو اسے اس کے آپے سے باہر کھینچ لاتی ہوں ۔ محنت کرواتی ہوں ۔ میں نہ ہوں گی تو یہ دنیا راکھ کا تودہ بن جائے گی ۔۔ آگ ، آگ نہیں ہوگی ۔۔ پانی پانی نہیں ہوگا ۔ سانپ ڈسیں گے نہیں تو خوف کہاں پناہ لے گا ۔ ! بھوک ہوگی نہیں تو انسان پیٹ بھرنے کے لئے ایندھن کاہے کو ڈھونڈے گا ۔ تم نے کیپٹلزم کے خلاف مارکسزم کی تھیوری کو اپنایا ہے ۔ مارکس کی تھیوری کو تم کیا خاک سمجھو گے جب کہ تمہیں انسان کی بقا اور ارتقا کا ادراک ہی نہیں ہے ۔ مجھ پر قابو پانے کا چکر تمہیں انسان بھی نہیں رہنے دے گا بلکہ تنزل کی طرف پیچھے دھکیل دے گا ۔ اور جسم کا یہ رہا سہا لباس نچوا کر تمہارے ہاتھ میں کمنڈل تھما دے گا ۔ سمجھے؟"
بھوک کی اسرار و معانی سے پُر تقریر سنتے سنتے بھوانی کا سر چکرانے لگا تھا ۔ اُسے طاقت کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی ۔
وہ دوڑتا ہوا کالی مندر پہنچا اور صحن میں رکھے مٹی کے کورے گھڑے سے غٹاغٹ ٹھنڈا پانی پی گیا ۔ پیٹ کی جلن مدھم ہوئی تو وہ اندر کی طرف لپکا اور دیوی کے قدموں میں گر پڑا ۔ جوں ہی اُس کی آنکھوں سے دھند چھٹنے لگی اس نے سر اٹھا کے دُرگا ماں کی طرف دیکھا ، دیوی کے قدموں میں پڑا بھبھوت اٹھا کر ماتھے پر تلک کیا اور پوری قوت سے اُٹھ کھڑا ہوا ۔

۳۱ جنوری ۹۱ء

"جے بھوانی ۔۔" پنڈال مزدوروں کی تالیوں سے گونج اٹھا ۔

قمر جمالی

...اور پھانسی دے دی گئی

رات کا ایک پہر گزر چکا تھا۔ مگر.. میری آنکھوں میں نیند کا کہیں پتا نہ تھا۔ ورنہ یوں ہوتا کہ دن بھر کی دوڑ دھوپ اور تکان سے ادھر بستر پر لیٹی کہ اُدھر غائب۔ پھر صبح دم تک مجھے خبر نہ رہتی کہ پلنگ کے عین سرہانے لگی دیوار گیر گھڑی کس طرح جاگ جاگ کر رات کی انتہائی سیاہ اور تنہا گھڑیاں گزارتی ہے۔ میں پہلو بدل بدل کر نیند کو آزماتی رہی مگر نیند بھی شاید مجھے آزمانے کی قسم کھا چکی تھی گزرتے ہر لمحے کے ساتھ مجھ پر خوف و دہشت کا غلبہ بڑھتا رہا، اور میں خواہ مخواہ ہی خوف زدہ ہوتی رہی کیونکہ ہزار کوشش کے باوجود کوئی بات مجھے ایسی یاد نہ آئی جو خوف بن کر یوں میرے ذہن میں محفوظ رہ سکتی تھی۔

گرما کی رات تھی۔ میں نے اپنی خواب گاہ کا دروازہ کھلا ہی رکھ چھوڑا تھا تاکہ صحن میں چلنے والے خنک ہوا کے جھونکے گاہے گاہے میری خواب گاہ میں آتے رہیں۔ رات کی خاموشی میں نٹ کھٹ بچے کی طرح خوابگاہ کے پردے ہلانے والے رات کی رانی کے جھونکوں سے مجھے ازلی عشق تھا۔ مگر آج ——؟ اُف! آج رات کی تو بات ہی اور تھی مجھے ہر چیز سے ڈر لگ رہا تھا —— ہر گھڑی بھاری لگ رہی تھی —— اور ہوا کے جھونکوں میں بسی رات کی رانی کی خوشبو کسی لاش کے کفن سے اٹھنے والی کافور کی بو محسوس ہو رہی تھی۔

جانے آج کون مرا ہو گا ——!! پھر میں نے سوچا مجھے اس سے کیا ——! کئی مرے ہوں گے۔ رات کے اسی پہر —— اسی لمحے —— گھڑی کے کانٹے کے اسی قدم کے ساتھ۔

اُف.. کتنی بھیانک ہے اس کی شکل ——! میں نے دیکھا پلنگ کے سرہانے

جہاں گھڑی لگی تھی وہاں ایک خوفناک شکل دکھائی دیتی تھی۔ شاید کسی خوف ناک انسان کی۔ مگر... انسان کی شکل اتنی خوف ناک کہاں ہوتی ہے —!! یا پھر کسی آدم خور حیوان کی —؟ بھینسا سور جیسی —؟؟ ہاں میں نے بھینسا سور دیکھا تو نہیں البتہ بچپن میں نانی اماں کی کہانیوں میں سنا تھا کہ بھینسا سور کی شکل انسان جیسی ہوتی ہے، مگر سر بھینسے کے سر کے برابر ہوتا ہے۔ آنکھیں باہر کو ابلی ہوئی اور زبان منہ سے باہر لٹکی ہوئی۔

رات کے گزرتے ہر لمحے کے ساتھ تازہ خون کا ایک قطرہ اس کی زبان سے ٹپک کر نیچے جانے کہاں جذب ہو رہا تھا۔ میں تو نیچے دیکھنے کی ہمت نہ کر سکی۔ بس ٹک ٹک اس عفریت کو دیکھتی رہی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے محسوس کیا کہ دل سینے سے نکل کر حلق میں اٹک گیا ہے، اور سانس اُکھڑ اُکھڑ کر چلنے لگی ہے۔ یک لخت میرا ہاتھ میرے شوہر کی پیٹھ کی طرف بڑھا کہ انھیں جگالوں۔ مگر... اتنی مہلت میں شاید میرے دماغ پر پڑا پردہ سرک گیا تھا۔ کیونکہ اب اُس عفریت کی جگہ مجھے پھر سے وہاں دیوار گیر گھڑی ہی دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے اپنی کم عقلی پر ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔ دل کو ذرا ڈھارس ہوئی تو خوف جاتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ نیند مہربان ہونے لگی ہے۔

ابھی کچھ ہی دیر سوئی ہوں گی۔ کیونکہ میں اپنے لاشعور میں ہوا کے سرسراتے جھونکوں، اور گھڑی کے قدموں کی آہٹ محسوس کر رہی تھی کہ... میں نے دیکھا — پتا نہیں خواب میں دیکھا ہو کہ — بیداری میں۔ بہر حال میں نے دیکھا کہ عدالت بھری پڑی ہے۔ جج ایک ملزم کا سر قلم کرنے کا حکم صادر کرتا ہے۔ یکا یک ملزم کے لواحقین کی آہ و بکا سے عدالت لرز اٹھتی ہے۔ اُسی عدالت میں کسی کونے میں بیٹھی میں بھی ہچکیاں لے رہی ہوں۔

.... پھر میں نے دیکھا کہ ملزم کو تختۂ دار تک لے جایا گیا۔ ملزم کے بازو ایک نہایت خوف ناک شکل والا، کالا مسٹنڈا جلاد اپنے داہنے ہاتھ میں ایک بڑا سا گنتہ[ؔ] لیے کھڑا ہے۔ پھر حکم صادر ہوتا ہے اور... جلاد کا ہاتھ اوپر اٹھتا ہے۔ بس — میں نے اتنا ہی دیکھا، اور چیختے چلاتے بیدار ہو گئی۔ میں نے خوفزدہ

ؔ بڑا اور چوڑے پھل والا چھرا۔

آنکھوں سے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کا کوئی ڈھائی بجا ہوگا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ یکایک مجھ پر خوف کا غلبہ ہوا اور میں بے قابو ہوکر چیخنے لگی۔ میری چیخ پکار سے میرے شوہر کی آنکھ کھل گئی۔ انھوں نے مجھے کتنا ہی سمجھایا کہ میں نے خواب دیکھا ـــــ مگر مجھے کسی پہلو چین نہ پڑتا تھا۔ میں بار بار یہی کہتی رہی کہ میں نے بیداری میں دیکھا ہے۔ رات کے اِس پہر ـــــ اسی لمحے کوئی قتل ہوا ہے میں موجود تھی وہاں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے چلاتی رہی کہ کسی کو شہید کر دیا گیا۔ مگر کس کو ـــــ؟ اس کا جواب نہ میرے پاس تھا اور نہ میرے میاں کے پاس۔

رات دیر گئے تک جاگتے رہنے کی وجہ سے صبح دن چڑھے سوتی رہی، کوئی ساڑھے آٹھ بجے کے قریب اٹھی اور حسب معمول وی وائس آف امریکہ، سننے کے لیے ریڈیو بجایا تو پہلی نشر ہونے والی خبر ـــــ "پاکستان کے سابق وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کو طلوعِ آفتاب سے قبل پھانسی دے دی گئی"۔ سنا تو ایک بار پھر میرے ذہن پر پچھلی رات کے خواب کے اثرات واضح ہونے لگے، اور میں اسی طرح چیختے چلاتے بے ہوش ہوگئی۔

میرے میاں کہتے ہیں مجھے فرسٹ ایڈ کے لیے دوا خانہ لے جایا گیا۔ قریب کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد مجھے ہوش آیا۔ مگر ذہن ابھی خواب کے اثرات سے پوری طرح آزاد نہیں ہوا تھا۔ آنکھ کھولتی تو مجھے اسی طرح کا احساس ہوتا اور میں سسک سسک کر رونے لگتی۔

"تم نے دیکھا آخر بھٹو کو پھانسی ہوگئی ـــــ!" میرے میاں میری اس بچکانہ حرکت پر جھنجھلا گئے۔

"اگر ہو بھی گئی ہے تو کون سا نیا کام ہوا۔ سیاسی کھیل ایسے ہی خطرناک ہوتے ہیں"۔ وہ مجھے چھوٹی بچی کی طرح سمجھاتے رہے۔

"سیاست مثل اس شمع دان کے ہے جو کسی خوابگاہ میں معلق لٹک رہی ہے۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ کبھی خوابگاہ کا دایاں بازو روشن رہتا ہے ـــــ تو کبھی بایاں۔ پالیٹکس میں بیوروکریسی کے موقف کو تم ابھی سمجھ نہ سکو گی۔

اس میں تو حریف اپنے سامنے والے کا سر کچل کر فخر محسوس کرتا ہے۔ اور پھر یوں بھی تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ بھٹو کون تمہارا سگا تھا ——— ؟"

اب میں انھیں کیا بتاتی کہ کسی بھی انسان سے میرا کیا رشتہ ہے ——! وہ خود بھی بڑے قابل اور روشن خیال انسان ہیں۔

ڈیڑھ دو گھنٹوں کے بعد ڈاکٹروں نے مجھے گھر لوٹنے کی اجازت دے دی۔

مجھے یاد ہے ہماری موٹر عابد سرکل سے گزر رہی تھی۔ ہاں۔ مجھے بس اتنا ہی یاد ہے۔ کیونکہ اس کے بعد دو دن تک میں مسلسل بے سدھ رہی —— میرے میاں کہتے ہیں کہ جب ہماری موٹر عابد سرکل سے گزر رہی تھی ایک لڑکا سڑک کے کنارے کھڑا اخبار بیچ رہا تھا۔

"آج کی تازہ خبر ——— پاکستان کے سابق وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کو آج صبح طلوع آفتاب سے قبل پھانسی دے دی گئی" وہ کہتے ہیں کہ میں نے اتنا ہی سنا اور گاڑی سے باہر سر نکال کر چلانے لگی۔

"ہاں ہاں دے دی گئی۔ یہ سچ کہتا ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے۔ رات کے ڈھائی بجے۔ میں وہاں موجود تھی۔" اتنا کہہ کر میں پھر سے بے ہوش ہو گئی۔

وہ کہتے ہیں ہماری گاڑی کے اطراف لوگ جمع ہو گئے تھے اور وجہ پوچھ رہے تھے، جنھیں وہ یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ ذوالفقار علی بھٹو کی موت کا مجھ پہ بُرا اثر پڑا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ لوگ پوچھتے تھے کہ ذوالفقار علی بھٹو سے میرا کیا رشتہ ہے ——؟

ہاں ——— کیا رشتہ تھا ———!! کیا یہ سب نہیں جانتے کہ دنیا کے پہلے انسان حضرت آدم سے ابھی تک ہمارا رشتہ قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا۔ مجھے لگا دنیا کے سبھی لوگ ایک جیسے ہیں اور اگر . . . سب ہی ایک جیسے ہیں ——— تو میں ہی الگ کیوں ——— ؟؟!

آج باہوش و حواس مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ایک بلند حوصلہ، باہمت

سیاسی مدبر کو جس کی شخصی یا سیاسی زندگی کے بارے میں مجھے زیادہ کچھ نہیں معلوم ——— اور یہ بھی نہیں کہ اُسے موت کی سزا حق بجانب ملی ہے

اُس سیاسی قیدی کو ۴ / اپریل ۱۹۷۹ء کو طلوعِ آفتاب سے قبل پھانسی دے دی گئی۔ " کُلُّ نفسٍ ذائقۃ الموت " ہر نفس موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے۔ چاہے وہ ذوالفقار علی بھٹو ہی ہو ——— یا احمد رضا قصوری۔

۴ / اپریل ۱۹۷۹ء

قمر جمالی

رات کے دس بجنے میں ابھی تین گھنٹے اور باقی تھے۔ پھر بھی گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا اس کی زندگی گھڑی کے لمحہ لمحہ بڑھتے پاؤں سے معلق لٹک گئی ہے۔ چہرے کا رنگ اُڑا اجارہا تھا اور جسم ہمالہ سے نکلے گلیشیر (GLACIER) کی طرح پگھل رہا تھا۔

یہ بات نہیں کہ ایسا موقع اس کی زندگی میں پہلی مرتبہ آیا ہو۔ مگر اس بار پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی ابھی دو دن قبل اُسے اس شہر میں منتقل کیا گیا تھا یہ بتاتے ہوئے کہ آپریشن ۱۲ مئی رات دس بجے کا ہے۔ اُس وقت وہ اس شہر کے سب سے زیادہ فیشن ایبل علاقے کی نہایت خوب صورت چار منزلہ عمارت کی چوتھی منزل کی بالکنی سے باہر جھانک رہی تھی۔ یکایک اُس کے گلے کی لاکٹ میں پیوست ٹرانسمیٹر پر اُسے سگنل ملا۔ حسبِ ہدایت لاسلکی فون پر ہدایت وصول کرنے وہ جوں ہی کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا ملا گھرن پہلے ہی سے ایک صوفے پر نیم دراز تھا۔

"تت۔ ۔ تم ۔۔۔ ! یہاں ۔۔۔ ؟ ابھی ابھی تو مجھے تمہارا سگنل ملا۔ !"

ہاں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اب تو تم سمجھ گئی ہوناکہ ملا گھرن کو کہیں پہنچنے کے لئے میڈیا (MEDIA) کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ہواؤں میں سفر کرتا ہے ۔۔۔ فضاؤں میں کبھی جسم

سے ــــ اور کبھی جسم کے بغیر۔ واگھرن موت کا دوسرا نام ہے۔ جہاں وہ ہوتا ہے ــــ وہاں زندگی تانڈو ناچتی ہے ــــ موت کا ناچ۔ سمجھیں؟"

"میں ــــ میں ــــ" بوکھلاہٹ میں بھول گئی کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔

ہاں ــــ میں بھی دیکھ رہا ہوں تمہارے چہرے کا رنگ اڑا جا رہا ہے۔ ہاتھ کانپنے لگے ہیں اور کانپتے ہاتھوں سے تاریخ نہیں لکھی جاتی۔ میں تمہیں چیتاونی دینے آیا ہوں۔ "BEWARE OF"

"آف واٹ؟" "OF WHAT" اَموکٹی تھوک نگل کر بڑی مشکل سے اپنا مفہوم ادا کر سکی۔

"OF WAGHREN" کیونکہ واگھرن کے قدم کبھی پیچھے نہیں لوٹتے ــــ اور آج واگھرن کے پاؤں سے تمہارا نام بندھ گیا ہے۔ سمجھیں؟"

"دھمکی دیتے ہو ــــ؟"

"دھمکی ــــ ہا اور نہیں ــــ!!" پھر بڑی دیر تک وہ تحقیر آمیز قہقہے لگاتا رہا۔ اَموکٹی کو لگا جیسے واگھرن کا ہر قہقہہ اس کی نفس سے بندھی برقی رو کو چھو رہا ہے۔ اس کے تن بدن میں برقی رو دوڑنے لگی۔ خون کی گردش کے تیز ہوتے ہی دھان پان سی اَموکٹی کے جسم میں شرارے پھوٹنے لگے۔

"بند کرو یہ قہقہے۔ تم جانتے ہو میں اپنی تحقیر برداشت نہیں کر سکتی۔ ٹارگٹ بتاؤ اور دفان ہو جاؤ"

"۲۸۹"

"شناخت ــــ؟"

"آدھا گھنٹہ قبل۔"

"کہاں ملے گا ــــ؟"

"شہر سے (۴۰) چالیس کلو میٹر دور ہائی راکس (HIGH ROCKS) پر وہ ایک بہت بڑی میٹنگ سے خطاب کرنے والا ہے۔"

"ذریعہ ــــ؟"

"تمہاری اپنی کار۔"

---

* ۱۔ خبردار رہو۔ * ۲۔ واگھرن سے

"نمبر — ؟"

"TTA - 495"

"ڈرائیور — ؟"

"سیلف۔"

"ہتھیار — ؟"

"تم خود۔"

"سمجھی نہیں۔"

"یہ تمہارا آخری آپریشن ہوگا۔"

"کیا — ؟" دہشت سے اموکٹی کی جان نکلتے نکلتے اٹک گئی۔

"تنظیم کا مقصد کئی ہزار زندگیوں سے زیادہ اہم ہے۔"

"پھر بھی — ؟"

"تمہارا نام بلیک لسٹیڈ ہے۔"

"اب میری ضرورت باقی نہیں رہی۔"

"تمہاری زندگی اب تنظیم کے لیے خطرہ بن گئی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ انشیورنس کامیاب ہوجائے گا۔" اموکٹی نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"واگھرن کو تمہارے انشیورنس کی ضرورت نہیں۔" پھر اُس نے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا اٹھا کر کامیابی کا سگنل دیا اور برق رفتاری سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

واگھرن کو رخصت ہوئے ایک گھنٹہ ہو گیا تھا۔ پھر بھی وہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی، بالکنی سے فضا میں دور تک اپنے جسم کے چیتھڑے اُڑتے دیکھتی رہی۔

کتنی گمنام مرے گی۔ نہ شمشان میں اس کی چتا جلے گی اور نہ آتما کی شانتی کے لئے اس کی اَستھیاں[1] گنگا کے سپرد کی جائیں گی۔ اپنی زندگی کا ایسا انت اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اماں تو کہتی تھی کہ اس نے اپنا سوامی کے حضور ماتھا ٹیک ٹیک کر فریاد کی تھی کہ اُس کی اکلوتی بیٹی کو سُمنگل[2] رکھنا۔ مرنے کے بعد بھی دلہن کی طرح سجی سنوری پی کے آنگن سے وداع کرنا۔

---

* ۱۔ نور * ۲۔ نیقن

مگر۔۔ وہ سب پلک جھپکتے میں کہاں کھو گیا ــــ! اماں کیسے صبح سے شام تک پوجا پاٹ کرتی اور اپنی چھوٹی سی گرہستی کو بنائے رکھنے کی کوشش کرتی۔! مگر شاید وہ ساری عبادتیں اور دعائیں اماں کے اپنے حق میں قبول ہو گئیں۔ سچ مچ ایک دن اچانک ہی اماں، اپا کا آنگن چھوڑ، دلہن کی طرح سجی سنوری اگنی پرویش کر گئی۔ اس دن چتا کے قریب کھڑی بارہ، چودہ سالہ امو کٹی بت بنی اماں کو ڈھونڈتی رہی۔ مگر پتا ہی نہ چلا کہ اگنی اماں کو بھسم کر گئی ــــ یا اماں خود اگنی نگل گئی۔

اماں کے جانے کے بعد اپا پر دیش پریم کا بھوت کچھ اتنا زیادہ سوار ہوا کہ امو کٹی کو وہ پاگل لگنے لگا۔ اپا کئی کئی رات گھر سے غائب رہتا ــــ یا آتا بھی تو امو کٹی کو اسے دیکھ کر خوف محسوس ہوتا۔ بڑھے ہوئے بال، ابلی ہوئی لال آنکھیں، چہرے پر وحشت اور درندگی۔ کبھی ہمت کر کے وہ جاننا بھی چاہتی تو اپا یا تو کوئی گول مول سا جواب دے دیتا، یا پھر ایسی خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھتا کہ امو کٹی کو لگتا کہ جیسے ہی وہ شریر[*] اپا کا رہا ہو ــــ مگر آتما ضرور بدل گئی ہے۔

کبھی کبھی اپا کے ساتھ واگھرن بھی گھر آتا۔ اور جب واگھرن ساتھ ہوتا تو، اپا اندر سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیتا اور پتا ہی نہ چلتا کہ واگھرن اپنے گھر کب لوٹتا۔ صبح امو کٹی کو اپا کا کمرہ کھلا ملتا اور اسے فرش پر سے دیسی شراب کی بوتلیں، ٹوٹی بوتل کے ٹکڑے ــــ اور ادھ جلے سگریٹ کے بے حساب ٹکڑے سمیٹنے پڑتے۔ کتنی نفرت ہونے لگی تھی اسے اپا سے ــــ! اور اپا بھی کتنا بدل گیا تھا۔! امو کٹی کو لگا کہ اب اپا کو راہِ راست پر لانا اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ کیوں کہ اب اپا انسان سے درندہ بن گیا تھا۔ سوتنتر سنگرام کا وہ راستہ پتا نہیں کہاں اس کے پاؤں سے چھوٹ گیا تھا۔ اب تو وہ اسے ٹھیٹھ جاتیہ وادی، آتنک وادی ــــ اور دیش دروہی لگنے لگا تھا۔

اس رات وہ دیر گئے گھر لوٹی تو دور ہی سے اپنے گھر کی چٹخنی گری دیکھ کر اسے ایک گونا اطمینان سا ہوا۔ اس کے اندر ایک بے چین سا احساس بیدار ہوا۔ اس نے سوچا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ آج اسے اس کا کھویا ہوا باپ مل جائے! کتنی اکیلی ہو گئی ہے وہ! اب کی بار وہ اسے جانے نہ دے گی۔ اس کے پیروں سے لپٹ جائے گی ــــ اس کی گردن سے جھول جائے گی اور ہزاروں بوسے لے کر اسے منائے گی اور پوچھے گی کہ خود زندہ رہ کر بھی وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو اناتھ سمجھنے پر کیوں مجبور کرتا ہے۔ وہ اسے سمجھائے گی۔ "اپا جس راستے پر تو چل رہا ہے، وہ راستہ نہ تجھے زندگی سے ملائے گا اور نہ ہی اس راستے میں کسی دوسرے انسان سے تیرا سابقہ پڑے گا!" وہ پوچھے گی

---

[*] ۱۔ جسم

کہ کیا اس کی تنظیم انسانی حقوق کی بحالی کے لئے سرگرداں نہیں ہے ـــــ ؟ اور اگر ہے تو وہ انسانوں سے منحرف کیوں ہے ــــ ؟ کیوں کہ جہاں حقوق پنپتے ہیں وہاں انسانیت زندہ رہتی ہے۔ ـــــ اور انسانیت زندہ انسانوں کے اطراف کھنچی روشنی کی لکیر کا نام ہے۔ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار کر وہ انسانیت کو زندہ کیسے رکھ سکے گا ــــ جن کے حقوق کی بحالی کے لئے وہ خود کو سنگرامی گرداننا ہے ــــ انھیں کی زندگیوں سے کیوں کھیلنے لگا ہے ـ !!

اِن ہی خیالات میں غرق جب وہ اپنے گھر کے اندر داخل ہوئی تو ہمیشہ کی طرح سارے گھر اندھیرا پڑا تھا ۔ ہاں مگر اَپا کے کمرے کی بتی جل رہی تھی اور دروازے کی جھری سے روشنی کی لکیر باہر آنگن کو چیرتی ہوئی کہیں دُور گم ہوگئی تھی ۔

اَپا کا حکم تھا کہ جب تک وہ خود باہر نہ آجائے اُسے آواز نہ دی جائے ۔ آج کل تو اموکٹی کی حالت اُس خوف زدہ ہرنی کی سی تھی جو چیتے کے مسکن کے آس پاس ہی کہیں رہتی ہو ۔ پھر اپا کے احکام کی خلاف ورزی اس کے بس کی بات نہ تھی ۔

مگر ۔ ۔ ۔ آج رہ رہ کے اس کے اندر کوئی جاگ رہا تھا ۔ اُس کے اپنے اندر ایک اِنقلاب آرہا تھا ۔ اُس کا انگ انگ یُوں ٹوٹ رہا تھا جیسے ہر عضو اپنی جگہ ایک مکمل جان رہا ہو اُس کے جسم کے کل سے آزاد ہو رہا ہو ۔

اموکٹی پہلے تو اس تشنجی کیفیت کو اپنے فرسٹریشن[1*] (FRUSTRATION) کا نتیجہ سمجھتی رہی ۔ مگر جب حالت قابو سے باہر ہوگئی تو اس سے رہا نہ گیا اور وہ دبے پاؤں اَپا کے کمرے کی طرف بڑھ گئی ۔ اُس نے اپنے آپ کو ایک طرف سمیٹا اور دروازے کی جھری سے اندر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی ۔ یکایک اسے لگا جیسے ایک تیز دھاری برچھی کی اَنی اُس کے دِل میں چُبھ کر ٹوٹ گئی ہے ۔ پسینے سے اُس کا جسم تر بتر ہوگیا اور سانس دھونکنی کی طرح بے قابو ہوگئی ہزار ضبط کے باوجود اس نے محسوس کیا کہ بغاوت کو دبانا اب اُس کے بس سے باہر ہوگیا ہے ۔ کان ، آنکھ اور ناک سے انگاروں کے ٹپکے نکلنے لگے ۔ اس نے ایک بار اپنے آپ کو ٹٹول کے دیکھا کہ کہیں دیو مالائی کہانیوں کی طرح اُس نے کوئی اور روپ تو دھارن نہیں کر لیا ـــ ! مگر ۔ ۔ ۔ ایسا کچھ نہیں تھا ۔ وہ اِنسان ہی تھی ــــ بالکل ویسی ہی ـــ پھر ۔ ۔ ۔ اُس کے جسم سے یہ اگنی ورشا کیسی !!

[1*] ۔ احساسِ نا اُمیدی ۔

اُس کا اپنا اَپّا جسے وہ دیوتا تو نہ سمجھتی تھی، پھر بھی درندوں سے بھی گیا گزرا ہوگا۔ یہ بات اُس کے تصور سے بعید تھی۔ وہ الٹے قدموں دوڑتی ہوئی اندر گئی اور ناریل چھیلنے والا تیز دھاری کتہ لیئے اس زور سے دروازے پر حملہ آور ہوئی کہ دروازہ پتا نہیں اندر سے بند تھا بھی۔۔ یا پھر بھگوان کی مرضی بھی یہی تھی کہ ایک ہی دھکے سے کھل گیا۔ پھر اس نے پوری قوت سے اَپّا کے سر پر وار کر دیا جیسے وہ اپا کا سر نہ ہو، درخت سے لٹکا ہوا کچا ناریل ہوا۔ مگر ــــ گردن کے سر سے جدا ہوتے ہی خون کا فوارہ اُبلتا دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی کہ اَپّا تو انسان ہی تھا ــــ اس کے جسم میں خون تھا، وہی خون جو خود اس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے ــــ اور وہی خون جو اَپّا کو اس کے اپنے اَپّا سے ورثے میں ملا تھا جو اپنے وقت کا بہت بڑا اسوتنتر سنگرامی تھا۔ پھر ــــ جو اس کی نظر اس عورت پر پڑی، تو اسے لگا۔ جیسے دیوانگی اس سے بس ایک ہی قدم پر کھڑی ہے۔ کیوں کہ جس کی عزت بچانے کے لئے اس نے اپنے باپ کا خون کیا تھا، وہ بے حد اطمینان سے یوں اکڑی کھڑی ہوئی جیسے اس کی عزت نہیں لوٹی جا رہی تھی، بلکہ کوئی مقدس کام ہو رہا تھا۔ مارے شرم کے اموکٹی نے اپنے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیئے۔

"تم نے غلط سمجھا بہن ــــ یہ لوگ دراصل میرے جسم کے اُن علاقوں پر اپنے پیغام اینکوڈ (ENCODE) کر رہے تھے جہاں جھانکنے کی ہمت سرکاری حکام بھی نہیں کر سکتے۔"

"تمھیں شرم نہ آئی۔ تم نے تو ساری ناری ذات کے کپڑے نچوا دیئے۔ تھُو۔ کتنی گندی ہو تم۔ اور یہ تمہارا شریر!"

"نہیں بہن۔! آج تم جسے بے عزتی سمجھ رہی ہو، کل وہی ساری قوم کا سر اُونچا کرنے کی ذمہ دار بنے گی۔ میں بے عزت کہاں ہوئی ہوں۔! کیونکہ میں تو بس ایک شریر ہوں۔ آتما تو میں نے کبھی کی تنظیم کے نام کر دی۔ اب تم ہی سمجھو آتما کے بغیر شریر کی شناخت ہی کیا۔! تم اس شریر کے گندہ ہونے کی بات کرتی ہو، اس ایک شریر کی بات ہی کیا ــــ اگر مجھے ایسے ہزار شریر ملیں تو میں وہ سارے کے سارے اِس تنظیم کے نام کر دوں"

غم و حشت سے نڈھال اموکٹی کو اِس عورت کی باتیں دُور کسی غار سے آنے والی آواز معلوم ہوئی۔ اسے اپنا جسم گوشت پوست کا نہیں مٹی کا تودہ معلوم ہوا۔ جو لمحہ لمحہ زمین پر ڈھیئے رہا ہو۔ دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ــــ کسی اور جگہ تھی۔ واگھرن کے مضبوط حصار میں۔ شاید اب اُس کی آتما بھی تحلیل ہو گئی تھی ــــ اور باقی رہ گیا تھا

ا * خفیہ تحریر میں لکھا۔

شریر۔
گھڑی کے گھنٹے کے ساتھ ہی وہ چونک اٹھی۔ دس بجنے میں صرف ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اِس وقت تو اُسے واگھرن کے ساتھ ہونا چاہیئے تھا، جہاں اس کا حلیہ تبدیل ہونا تھا۔ بڑی تیزی سے وہ اپنے فلیٹ سے نکلی اور ٹیکسی کے ذریعہ جائے مقصود پہنچ گئی۔ حلیہ تبدیل کرنے کے بعد واگھرن اُس کے ساتھ لفٹ تک اُسے چھوڑنے آیا۔ یہ شاید اُس کا اپنا طریقہ تھا بڑھاوا دینے کا یا پھر، اس کی کوئی چال۔

اب صرف آدھا گھنٹہ ـــــ اور پھر۔۔۔ ۔آپریشن 789 ۔" واگھرن نے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا اٹھا کر اموکٹی کو آگے بڑھنے کا اشارہ دے دیا۔

لفٹ سے نکل کر وہ تقریباً دوڑتی ہوئی کار تک پہنچی، اور حسب ہدایت ٹارگٹ کی شناخت کے لیے جوں ہی اس نے ڈرائیونگ سیٹ کی گدی اٹھائی، اُسے لگا جیسے دل کے اندر کوئی شریان تڑپ کر پھٹ گئی ہو۔ اُسے محسوس ہوا اندھیرے کا ایک پہاڑ بڑی تیزی سے اُڑتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ گھبرا کر اس نے جلدی سے سیٹ گرادی اور خود بھی دھڑام سے سیٹ پر دراز ہو گئی۔

"او ـــــ واگھرن ـــــ واگھرن ـــــ تو شیطان بن گیا ہے"
ندی کی باڑھ کی طرح چڑھتے غصے کو اتنے کم وقت میں قابو میں کرنا اس کے لیے بڑا مشکل تھا۔ اس نے جلدی جلدی موٹر کے شیشے چڑھائے اور واگھرن سے بات کرنے کے لئے خفیہ ٹرانسمیٹر کا سوئچ آن کیا ہی تھا کہ کال ریسیونگ سگنل بجنے لگا۔ اُس نے جلدی سے ٹرانسمیٹر کا ریسیور اپنے کان سے لگا لیا۔
"کار کی پچھلی سیٹ پہ ایک بکے (BOUQUE [1]) رکھا ہے۔ تمہارا کام اس بکے کو ٹارگٹ کے ہاتھ میں تھما دینا ہے۔ اوور اینڈ آل ـــــ رابطہ کاٹ دیا گیا ـــــ اوور اینڈ آل" پھر کھٹ کھٹاک کی آواز کے ساتھ ہی ٹرانسمیٹر خاموش ہو گیا۔
"یو ـــــ باسٹرڈ ـــــ سن آف اے سوائن (SON OF A SWINE [2])"
پاگلوں کی طرح وہ خود ہی اپنے بال نوچتی رہی۔

---

۱ گلدستہ ۲ سُوَر کا بچہ

"تم ـــــ تم درندہ بن گئے ہو۔ اپنے اصولوں سے پھر گئے ہو۔ اس شخص کو ختم کر دینا چاہتے ہو جو کبھی بھی تمہارا دشمن نہیں رہا جس کی ساری نسل اس دیش کی خدمت کرتی رہی ـــــ جس کی ماں نے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی دھرتی کے پیاسے ہونٹوں میں ٹپکا دیا تاکہ یہ دھرتی تڑتڑ کر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائے۔ پھر بھی تم ـــــ او ـــــ واگھرن تم شیطان بن گئے ہو ـــــ اور میں شیطان کی پیروی نہیں کر سکتی"!

پسینے سے شرابور چہرہ پونچھنے کے لیے جوں ہی اس نے جیکٹ کے اوپری جیب میں ہاتھ ڈالا جیب کے نیچے ٹک ٹک کرتی آواز کو محسوس کر کے اُسے یقین ہو گیا کہ زندگی کی گاڑی سیٹی دے چکی۔ ابھی آدھا گھنٹہ قبل جب اس کا حلیہ تبدیل کرنے کے لئے اسے بے ہوش کیا گیا تو اُن شیطانوں نے اس کے جسم کے اندرونی حصے پر بم باندھ دیا تھا۔

واگھرن کے خلاف اپنے دل میں اٹھتے طوفان پر قابو پانا مشکل تو تھا، مگر اموکی جیسی بلند حوصلہ لڑکی کے لئے ناممکن ہرگز نہیں۔ اگرچہ کہ اس کی کنپٹی کی رگیں بری طرح تن رہی تھیں، اور وہ خود کو اتنی بے بس محسوس کر رہی تھی جیسے بلّی کے پنجے میں دبی چوہیا۔ پھر بھی حوصلے بلند ہوں تو کیا کچھ نہیں کیا جا سکتا ـــــ ! جان تو بہر کیف دینی ہی تھی۔

اسٹیرنگ وہیل پر سر رکھے، آنکھیں بند کئے بڑی دیر تک وہ اپنے اندر ہوتی جنگ کے ختم ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ دوبارہ جب اس نے سر اٹھایا تو آنکھوں سے مایوسی کی دھند چھٹ چکی تھی۔ آسمان صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ساحل کی طرف سے آتی خنک ہواؤں سے اُسے تازگی کا احساس ہونے لگا تھا۔ پھر ـــــ ایک عزم کے ساتھ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور لمحہ بھر میں اس کی گاڑی مجبوری کی لاش کو روندتی ہوئی گزر گئی۔

وقتِ مقررہ سے کچھ منٹ قبل ہی وہ ہائی راکس (HIGH ROCKS) پہنچ گئی آس پاس نظریں گھما کر اُس نے واگھرن کو تلاش کیا جو اُسے کہیں نظر نہ آیا۔ پھر اُس نے سوچا کہ اُس بہروپیے کا کیا بھروسہ ـــــ !

حوصلے کی پختگی سے اُس کی چال میں اعتماد آ گیا تھا۔ اُسے خود کو جرنلسٹ گیلری (JOURNALIST GALLARY) میں شامل کرتے ہوئے کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ اسے تعجب تو اس بات پر ہوا کہ کسی نے اُس

۱۔ حلقہ

کاشتناختی کارڈ دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا۔ پروگرام کے مطابق ایک کار پنڈال سے ذرا فاصلے پر آرکی۔ ۱۰۶۱۷ لاؤنج کے لوگ احتراماً کھڑے ہوگئے۔ لوگ جوش وخروش سے ہاتھ ہلاتے ہوئے زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔ کار کا دروازہ کھلا اور ٹارگٹ دونوں ہاتھ جوڑے نمودار ہوا۔ کتنا مقدس لگ رہا تھا وہ اس وقت! سفید کرتا پاجامہ اور گلے کے اطراف لپٹا کھادی کا زرین کور والا کھنڈوا، متناسب قامت، ستوان ناک، سرخ وسپید رنگت، چالیس پینتالیس کا سن ــــ اور ہونٹوں پر مشفقانہ مسکراہٹ۔ جوں جوں ٹارگٹ پنڈال کے قریب بڑھتا رہا امو کٹی کو لگا کہ اس کا دل سینہ پھاڑ کر باہر نکل پڑے گا۔

پنڈال کے قریب پہنچ کر ٹارگٹ نے وی۔ آئی۔ پی لاؤنج کی طرف رخ کئے نمسکار کیا۔ پھر جیسے ہی ٹارگٹ کا رخ جرنلسٹ گیلری کی طرف ہوا، امو کٹی نے الٹی گنتی گننا شروع کر دی۔ اس کے دل ودماغ میں ایک ہیجان برپا تھا۔ بس دس قدم ــــ دس قدم رہ گئے تھے۔ ان دس قدموں کے بیچ اسے ایک تاریخ لکھنی تھی۔ عورت کی مہانتا کی تاریخ؛ جو اس سے اس کے کرتویہ کا پالن چاہتی تھی۔ عورت جو ماں بھی ہے بیوی بھی ــــ دیوی بھی ہے فقط ناری بھی۔ لکشمی بھی ہے اور درگا بھی۔ سیتا بھی ہے رانی جھانسی بھی۔ سب سے اُتم بات تو یہ کہ دنیا کا ہر مرد اسی کا جنما ہوا ــــ پھر ــــ جسے جنما اسے خود ہی کیا مٹانا ــــ !

دس ــــ نو ــــ آٹھ "امو کٹی کے اندر بڑی تیزی سے تبدیلی آرہی تھی۔

"سات ــــ چھ" اس نے محسوس کیا کہ اس کی شخصیت تحلیل ہونے لگی ہے۔ پھر وہ یہ سوچ کر نشچنت ہو گئی کہ شریر سے سانسوں کا سمبندھ چاہے جیسے چھوٹے انت تو بس ایک ہی ہے۔ اگنی پرویش۔ اس نے اپنی گنتی جاری رکھی۔

"پانچ ــــ چار ــــ تین ــــ دو"

پلک جھپکتے میں وہ دوڑتی ہوئی ٹارگٹ کے اطراف باڈی گارڈ کئے پولس افروں کے درمیان پہنچی اور ان میں سے ایک کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف پلٹایا۔

"میں امو کٹی ــــ بلیک پینتھر واگھرن ــــ منتری مہودے ٹارگٹ پر ــــ"

آخری گنتی " ایک ــــ" اس نے حلق پھاڑ کر کہا اور بجلی کے جھماکے کی طرح انسانوں کے نرغے سے باہر ہو گئی ــــ ہجوم سے دور ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ - - - - - - - - - - - - -

پھر . . . . شریر کا اگنی پرویش

۲۰ / ستمبر ۱۹۹۱ء

قمر جمالی

نئی کرن

"جانور"

ایک بار پھر اپیا کے منھ سے نکل گیا۔ جانے کتنی بار وہ اب تک اس اسم غیر معرفہ کی تکرار کرچکی تھیں۔ ہر بار اماں بی بڑی امید سے سرِ راہِ انتظار اپنی آرزوؤں کا چراغ جلا دیتیں جو صبحِ کاذب تک چمک چمک کر جلتا، اور صادق سے پہلے خود اپیا ہی اُسے پھونک مار کر بجھا دیتیں۔ پھر۔۔ کسی عمر رسیدہ خاتون کی طرح اماں بی کو دلاسا دیتیں۔

"اماں بی! وہ ضرور آئے گا جس کی میں امانت ہوں۔ یوں ایک کی امانت دوسرے کے سپرد نہیں کی جاتی۔ اور تم تو جانتی ہو دو دلوں کا میل خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ پھر خدا کے دربار میں ناانصافی، خیانت اور بددیانتی کا دخل کہاں ۔۔!

اپیا کی تسلی سے اماں بی کی ہمت بندھ جاتی اور ان کی دھندلائی ہوئی آنکھیں ایک بار پھر چمک اٹھتیں۔ شاید اپیا کی شادی کی آرزو اور خدا سے بندھی امید ہی اماں بی کی آنکھوں میں بینائی بن کر سما گئی تھی ورنہ نوّے کے لگ بھگ ہو کر بھی اُن کے قوی برابر تھے۔

آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اماں بی نے کسی کا تذکرہ چھیڑا کہ اپیا کا پارہ چڑھ گیا۔ مگر اپیا کی ہمت افزا باتوں سے اُن کی ٹوٹی ہوئی امید ایک بار پھر بندھ گئی، ناتواں لب مسکرا پڑے، اور کھونسے سے تھرتھراتے ہاتھ دعا کے لئے اٹھ گئے۔

"پروردگار ۔۔! میری بیٹی کے سہرے کے پھول

جلد کھلا دے۔"

اپیا اپنے کمرے میں جاتی ہوئی اماں بی کی دعا سے پُر خلوص دُعا سن کر مسکرا پڑیں مگر دوسرے ہی لمحے زمانے کی سختی ان کی آنکھوں میں سمٹ آئی اور ہونٹ غصے سے بھنچ گئے۔

"پودا تم نے لگایا ہی کب تھا اماں بی کہ پھول کھلتے۔!!" اپیا کا طنز بھرا فقرہ سنتے ہی اماں بی چونک پڑیں۔ دعا کے لئے اُٹھے ہوئے ہاتھ نیچے گر پڑے اور وہ سوالیہ نظروں سے اپیا کی طرف دیکھنے لگیں۔ وہ ایک جہاں دیدہ عورت تھیں۔ وقت کے ماتھے کی لکیریں پڑھ لیتیں تو کیا اپیا کی مسکراہٹ میں پنہاں درد کو محسوس نہ کرتیں! گھڑی دو گھڑی قبل جو چمک ان کی آنکھوں میں نمودار ہوئی تھی وہ یکا یک ماند پڑ گئی۔ بجھتے دیئے کی لو کو تھرتھراتا دیکھ کر اپیا تلملا اٹھیں اور الٹے پاؤں آکر اماں بی کے تخت پر بیٹھ گئیں۔

"بعض سچائیاں ایسی ہوتی ہیں اماں بی! کہ انھیں مصلحتوں پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ پھول تو اب اس گلشن میں کھل نہیں سکتے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی سلا ہوا پھول اٹھا کر میں ہی اپنے جوڑے میں اڑس لوں۔ مگر میں ایسا کروں گی نہیں۔ سچائی تو بس سچائی ہے چاہے کتنی کڑوی ہی کیوں نہ ہو۔" اپیا نے اپنی ساڑی کے پلو سے اماں بی کے آنسو پونچھے اور سروتے سے چھالیہ کتر کر اپنے منھ میں ڈال لی۔ پھر پان کی کشتی اماں بی کے قریب کرتے ہوئے بڑی بوڑھیوں کی طرح انھیں بہلانے لگیں۔ "لو پان کھالو۔ کب سے بیٹھی ہوئی ہو؟ آرام سے لیٹی رہو نا۔ پان کھاؤ نا۔ لاؤ میں بنا دوں۔"

اپیا کی شفقت بھری باتیں سن کر اماں بی کا دل بے قابو ہو گیا اور دامنِ ضبط ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"رو نہیں اماں بی! چپ ہو جاؤ۔ نہیں تو تمہارے آنسوؤں میں بہہ کر میں کہیں گم ہو جاؤں گی۔" پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی اپنے کمرے میں گھس پڑیں۔

یہ کوئی نیا تماشہ نہ تھا۔ تقریباً ہر دن ایسا ہوتا تھا۔ کبھی اپیا، اماں بی کو پچکارتیں، اور کبھی اماں بی اپیا کو۔ اور کبھی اپیا پیچ و تاب کھاتی ہوئی اپنے کمرے میں گھس جاتیں تو رات بھر جانے کن کن روحوں سے ہم کلام رہتیں کہ صبح اُٹھتیں تو ان کی آنکھیں سرخ اور چہرہ متورّم ہوتا۔ اپیا کا کمرہ کیا تھا کتابوں کا قبرستان تھا۔ کبھی کبھی اماں بی اکیلی بیٹھی بیٹھی اکتا جاتیں اور گرتی پڑتی دیوار کا سہارا لے کر اپیا کے کمرے میں گھس جاتیں تو بس کہرام مچ جاتا۔ اپنی کمزور اور لاغر آواز میں مقدور بھر چیخ چیخ کر آسمان سر پہ اٹھا لیتیں۔

"اس قبرستان میں بس کر تو بھی ایک لاش بن گئی ہے۔ ٹھہر کل جب تو مدالت ہو دے گی

میں ان قبروں میں آگ لگادوں گی ۔"

"نہیں نہیں اماں بی! خدا کے لئے ایسا نہ کرنا۔ ایک ایک قبر کو پختہ کرنے میں میں نے اپنی ساری توانائی اور کمائی خرچ کی ہے ۔ کوئی بھی کتاب چار پانچ سو سے کم نہیں ہے ۔"

"چار پانچ سو ۔۔! اپنے پوپلے منھ سے اماں بی اپیا کو چڑاتیں تو زمانے کی ساری سختی بھول کر اپیا جھوم جھوم کر ہنسنے لگتیں ، پھر ان کی کمر میں باہیں ڈالے ان سے لپٹ جاتیں ۔

"میرا یہ قبرستان ، جنّت البقیع کی طرح مقدس ہے ۔ یہاں تو زور سے بات کرنا بھی منع ہے ۔ اگر میں یہ کتابیں نہ پڑھوں ، تو دوسروں کو مصیبت سے نجات کیسے دلواؤں گی ۔ آپ کو تو فخر ہونا چاہیئے کہ آپ کی نواسی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

"وکیل ہے وکیل" اماں بی تلملا اٹھیں ۔ ارے بھاڑ میں جائے ایسی وکالت ۔ جانے کون کیئے کی سزا بھگت رہی ہوں تجھے وکالت پڑھا کر ۔ میں تو چاہوں تیری گرہستی ہو ۔ ننھے ننھے بچے ہوں جنھیں میں گودوں کھلاؤں ۔ وہ مجھے تنگ کریں میری جان کھائیں ۔"

"یہی تو میں نہیں چاہتی ۔ کتنا دکھ ہوگا مجھے جب وہ آپ کو تنگ کریں گے ۔"

"دیکھو کی بچی ۔۔۔" سامنے پڑی ایک کتاب اٹھا کر وہ اپیا پر مارنے دوڑتیں ، مگر کتاب اُن سے اٹھتی کہاں تھی ۔۔۔! پھر اپیا بھی ڈر جاتیں کہ جلد نہ اکھڑ جائے ۔ دوڑ کر کتاب ہاتھ سے لے لیتیں اور انھیں بہلاتیں ۔

"اُفو ۔۔۔! اتنا جلال ۔۔۔! توبہ ۔۔۔! کون کہتا ہے شادی نہیں کرنی ہے ۔ ارے اماں بی! شادی کیئے بغیر یہ پہاڑ سی زندگی کیسے کٹے گی ۔ مگر ۔ ۔ ۔ ۔"

"مگر کیا ۔۔۔؟" اماں بی خوف زدہ ہو جاتیں کہ صراطِ مستقیم پر چلتے چلتے اپیا کی گاڑی پھسل نہ گئی ہو ۔

اپیا ، اماں بی کی آنکھوں میں خدشوں کے سایے ابھرتے دیکھتیں تو ہتھیار ڈال دیتیں ۔ مگر ۔ ۔ آج ہمیشہ کی طرح اپیا کو نرم پڑتا ہوا دیکھ کر اماں بی جلدی جلدی تسبیح گھمانے کے بجائے اُلٹے ان کے سر ہو گئیں ۔

"تو کہہ دوں اُس سے ۔۔۔؟" بجھتی آنکھوں میں امیدوں کے چراغ لئے وہ سراپا سوال بن گئیں ۔

"آپ کا مطلب اُس منظور ے والے سے ہے ۔۔۔؟"

"ہاں ہاں اُسی سے ہے۔ ارے باٹ بڑی روٹی کون بھو کا ٹھکرائے۔ میں پوچھتی ہوں اس زمانے میں شریف لڑکے ملتے کہاں ہیں۔ لڑکا اچھا ہے صحت مند، خوبرو خوش پوش اور کمائی پوت۔ کیا ہوا اگر وہ تیری طرح سرکار کی چاکری نہیں کرتا۔ بڑے پلے کا بیوپاری ہے۔ پھر مسلمانوں کے لئے بیوپار کرنا سُنّت کی پیروی کرنا ہے مجھے تو یہی پیشہ پسند ہے نہ کہ تیری موئی عدالت جہاں چکنی چپڑی جھوٹ سے سچ کا منھ کالا کیا جاتا ہے۔"

ہمیشہ کی طرح آج بھی زکریا رومی کا نام سن کر اپیا کا خون کھول گیا۔ ہزار ضبط کے باوجود لفظ جانور، ان کے منھ سے نکل ہی گیا۔

"حدِادب میں رہنے کی کوشش کرلڑکی۔ خدا سے ڈر" وہ بھول گئیں کہ اماں بی بالکل ان کے قریب کھڑی ہیں اور کتابیں اب بھی ان کی دسترس سے باہر نہیں ہیں۔

"لو میں نے توبہ کی اماں بی۔ اب جاؤ۔ پلیز۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

زکریا رومی کا نام ہی ایسا تھا جسے سن کر اپیا آپے سے باہر ہو جاتیں۔ کبھی ان کی زندگی سے جڑا ہوا تھا یہ نام۔ مگر اب نفرت اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ وہ اس نام کو بھی اپنی زبان سے ادا نہیں کر سکتی تھیں۔ محبت پر سے اُن کا ایمان اٹھ گیا تھا۔ نفرت کی یہ دین ان کی زندگی میں زہر ہلاہل گھول چکی تھی اور وہ محبت بھری شگفتہ مزاج عرفیہ ان کی اپنی شخصیت میں کہیں دب گئی تھی اب تو وہ صرف اور صرف اپیا بن کے رہ گئی تھیں صرف عظمیٰ ہی کی نہیں ، ہمارے زمانے کی۔ اور انھوں نے اس رشتے کا بھرم کچھ اتنا نبھایا کہ اب یہ رشتہ ان کے نام کی جگہ اُن کی شناخت بن گیا تھا۔

اپنی شخصیت کا بھرم اور مزاج کی سنجیدگی سنبھالتے سنبھالتے اپیا بھول ہی گئیں کہ دل کے کسی گوشے میں ابھی وہ لو بجھی نہیں جسے ایک عام عورت کی طرح چاہے جانے کی چاہ ہے۔ تب ہی تو زکریا رومی کے نام کو وہ اور مردوں کے نام کی طرح سن کر گزر نہیں جاتیں بلکہ چراغ پا ہو جاتی تھیں۔ یہ بھی محبت کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔ شاید اپیا نے کبھی اپنے جذبات کا تجزیہ نہ کیا ہو اور پیار کی بھوکی عرفیہ کو اپنے اندر زبردستی دبا کے رکھا ہو یا پھر۔۔۔ وہ شاید بنتی رہی ہوں۔ مگر جو بھی ہوا ایسا کرنے میں اکیلی اپیا ہی قصوروار نہیں تھیں۔ یہ تو وقت اور حالات کا گٹھ جوڑ تھا جس نے پیار اور محبت کی مورتی عرفیہ کا پیار پر سے بھروسا اٹھا دیا تھا۔ بس ایک لمحے میں۔ وہ اُس ایک لمحے کو قید نہ کر سکیں جو ریگستان کی آندھی کی طرح

ان کی نگاہوں کے سامنے سے گزر گیا اور وہ ـــــ ؟ وہ تو صرف اپنی آنکھوں سے ریت کے ذرّے صاف کرتی رہ گئیں ۔ وہی ایک لمحہ تھا جب معصوم سی عرفیہ نفرت کے بوجھ تلے دب گئی، اور اس کی جگہ بارعب اپیا نے لے لی ۔ محبت کے نقوش بھی کتنے گہرے ہوتے ہیں ـــ! وقت و حالات کے تقاضے سیلابی زووں کی طرح اوپر سے گزر جاتے ہیں پھر بھی تاحیات دھندلے دھندلے ہی سہی باقی رہ جاتے ہیں ۔ تب ہی تو ہزار کوشش کے باوجود وہ اس لمحے کو فراموش نہ کر سکیں ـــ اور وہ لمحہ جوں کا توں مقیّد رہ گیا ان کی آنکھوں کی پتلیوں میں ۔

شام کا سانولا چہرہ برقی قمقموں کی جھالر لگا ڈوپٹا اوڑھ کر نکھر اٹھا تھا ۔ زرق برق کپڑوں کی سرسراہٹ، کھنکتے قہقہے اور عطر بیز فضا ریں ماحول مدہوش کن ہو رہا تھا ۔ فنکشن ہال مہمانوں کی بہتات سے پھٹا پڑتا تھا ۔ ہم مزاج لوگوں کے گروہ در گروہ نظروں کے آگے سماں باندھ رہے تھے ۔ کوئی فقرہ بازی میں مست تو کوئی بادہ خواری میں مگن ۔ کچھ فاصلے پر ریکہ پیتشن ہال میں مدّھم سی زرد روشنی میں مغربی دھن پر تھرکتے انجانے جوڑے ۔ یہ سب وہ کاہے کو دیکھنے گئی تھیں ۔ انھیں تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ قانون کی ماسٹرز ڈگری رکھتے ہوئے بھی وہ نری اجڈ ہیں گنوار! وقت کتنا آگے نکل گیا تھا ـــ! گھر سے عدالت اور عدالت میں حق و باطل کو ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی جد و جہد ۔ اسی اُدھیڑ بُن میں انھوں نے دیکھا ہی نہیں کہ وقت کی چال کتنی بدل گئی !

انھوں نے محسوس کیا کہ انھوں نے خود سے انصاف نہیں کیا ۔ کس قدر پچھڑی ہوئی ہیں وہ ـــ! پھر انھوں نے اپنا موازنہ مختلف لڑکیوں سے کیا جو نہایت اطمینان سے لڑکوں کے ہاتھوں استعمال ہو رہی تھیں جیسے اپنا پیدائشی حق استعمال کر رہی ہوں ۔ سماج لیکن انا لڑکیوں کو بھی برداشت کرتا ہے ۔ پھر ۔ ۔ ۔ انھوں نے خود اپنے اطراف یہ لکشمن ریکھا کیوں کھینچ لی ـــ! وہ اپنے اوپر لعن طعن کرتی رہیں اور ہر طرح خود کو موجودہ نظام میں ضم کرنے کے لئے مدلّل وجوہات ڈھونڈتی رہیں ۔ مگر ہر بار وہ اپنی دلیلوں کے آگے سپر انداختہ ہو جاتیں، کیونکہ ہر بار فیصلہ کرنے سے قبل ان کا ضمیر اُس نظام کی مدافعت کے لئے آگے بڑھ جاتا ۔ " حیا بہ ورحجاب ـــ آلودہ نگاہوں کا وقار ایک الگ چیز ہے ۔ اس کی مثال اس ہیرے جیسی ہے جو ہر جوہری کی دکان پہ دستیاب نہیں ہوتا ۔ اُس حسن کا ذکر ہی کیا جو راہ چلتے ہر مرد کی نگاہوں سے ٹکرا کر گھس گیا ہو ـــ! حسن ہو تو ایسا ۔" ان کے ضمیر نے خود اُن کی شبیہ کو اُن کے مقابل کھڑا کیا تو وہ

شرم سے پانی پانی ہوگئیں ۔ سانولی سلونی رنگت، کمانی ابرو خاموش جھیل جیسی بڑی بڑی آنکھیں یہ آنکھیں ہی تو تھیں جو ان کے لئے وبال بن چکی تھیں۔ رومی نے تو کہا تھا ــ وہ کس بلا کا جادو ہے ان آنکھوں میں ۔ دیوی جی ! خدا کے لئے ادھر کم ہی دیکھا کریں ورنہ یہ بندہ تو ڈوب جائے گا "

"ہیلو عرفیہ ۔ اکیلی بیٹھی ہو ۔ چلو ادھر چلتے ہیں " اُن کا کوئی کلیگ تھا جو انھیں اکیلا دیکھ کر ان کے قریب آگیا تھا۔ یہ کوئی پہلی پیش کش نہیں تھی ۔ اب تک بیسیوں ساتھیوں نے انھیں اپنے ساتھ بیٹھنے کا مشورہ دیا تھا ۔ مگر وہ سب کو ٹالتی رہیں ۔ وہ پریشان تھیں کہ خود کو کس ٹولی میں شامل کریں ۔ وہاں تو سب ہی ایک دوسرے میں گتھے ہوئے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ خود کو اس ماحول کے مطابق نہیں پاتی تھیں ۔

ہمیشہ ہی وہ اس طرح کی دعوتوں سے پرہیز کرتی آئی تھیں ۔ مگر اس بار وہ ٹال نہ سکیں کیونکہ یہ اس سشن جج کی دختر کی شادی پر دیا گیا عشائیہ تھا جس سے وہ خود وابستہ تھیں ۔ پھر دولہا بھی انہی کے ساتھ کام کرتا تھا ۔

شومئی نصیب کہ وہ جہاں بیٹھی تھیں وہاں سے سارا ماحول ان کی نگاہوں کی زد میں تھا۔ کبھی کبھی ان کی نظریں بال روم فلور کی طرف اٹھ جاتیں تو ان کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی " اللہ توبہ " وہ اپنے دماغ کی رَو کو جھٹک کر دوسری طرف خود کو مصروف کرنے کی کوشش کرتی رہیں مگر نظر آخر نظر ہے بھٹک بھٹک کر پھر اُسی جوڑے پر جمتی رہی، جس کی طرف سے وہ نظریں چرا رہی تھیں ۔ عورت ان کی نگاہوں کا مرکز نہیں تھی، وہ تو اُس مرد پر نظر پڑنے ہی پریشان ہو رہی تھیں جو ان کے اپنے رومی سے ملتا جلتا تھا۔

" ہزار بار توبہ ۔ اب ہرگز نہیں دیکھوں گی " انھوں نے اپنے تئیں عہد کر لیا کیونکہ مارے گھبراہٹ کے سارے جسم میں جُم جُم ٹھنڈی بوندیں ابھرنے لگی تھیں، اور آنکھیں ستمبر کے اسمان کی طرح بھیگنے لگی تھیں ۔

" میں نروس ہو رہی ہوں " انھوں نے اپنے آپ کو ٹٹولا۔

" نہیں ــ میں گنوار ہوں " انھوں نے خود ہی اپنا تجزیہ کر لیا ، اور بہتری اسی میں جانی کہ وہاں سے نکل چلیں ۔ پھر خیال ہوا کہ میزبان سے ملے بغیر جانے سے تو آنے کا مطلب ہی فوت ہو جائے گا ۔

اب اُن کی نگاہیں ہر طرف جج صاحب کو تلاش کرنے لگیں ۔ مگر وہ جج صاحب کو

ڈھونڈیں بھی کہاں — ! جدھر بھی نگاہ اٹھتی کسی نہ کسی کو اپنی طرف دیکھتا محسوس کرتیں۔

"اُف قسم خدا کی مر جاتا جو ذرا آنچل میں پناہ ملتی —!" کسی منچلے نے فقرہ کسا اور ان کی بھنویں تن گئیں۔

"کم از کم اظہار کی آزادی تو ہے اس ملک میں۔ حقِ رائے دہی THE RIGHT OF FRANCHISE کیوں محترمہ — ؟" اُسی نوجوان نے ہاتھ جوڑ کر کہا تو عرفیہ کو اپنی غلطی پہ ندامت ہوئی۔

"ہائے — عرفی !" اپنے ہی خیالوں کے جھرمٹ میں حیران و غلطاں تھی کہ کسی کے آواز دینے پر وہ بوکھلا گئیں اور پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو اوسان خطا ہو گئے۔ اجڈ گنوار کی طرح منہ کھولے وہ اُس جوڑے کو دیکھتی رہیں جسے کچھ دیر قبل وہ ڈانس فلور پہ دیکھ چکی تھیں۔

"ارے — کدھر کھو گئی۔ مِیٹ (MEET) مسٹر زکریا رومی۔ اور مسٹر رومی یہ میری کالج میٹ (MATE) ہے عرفیہ۔ قانون کی ماسٹرز ڈگری رکھتی ہے۔ مگر ایک خاص بات ہے اس کے مزاج کی۔ یہ صرف سیاہ کوٹ پہن کر ہی نڈر بن سکتی ہے۔ سیاہ چغہ اتارتے ہی عدالت کا یہ تناور درخت ایک دم چھوئی موئی کا پودا بن جاتا ہے۔ ارے — یہ تم دونوں کو کیا ہو گیا — ؟!"

ونیتا کو کیا پتا تھا کہ عرفیہ پہ کیا قیامت ٹوٹی —! ونیتا اُن باتوں سے بے خبر، حیران و پریشان کبھی عرفیہ کو دیکھتی رہی تو کبھی رومی کو۔ اس مثلث میں اگر کوئی مطمئن تھا تو وہ تھا رومی کیونکہ عرفیہ کی پریشانی دیکھ کر اس کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی تھی۔ اس نے دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ وہ اِس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھائے گا۔ لہذا ایک اجنبی کی طرح کسی قسم کا تاثر دیئے بغیر خاموش کھڑا رہا۔ آخر ونیتا سے ہی رہا نہ گیا۔

"عرفیہ — میں نے کہا یہ مسٹر زکریا رومی ہیں۔ فلورنس کلاتھ مل کے مالک۔ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔"

رومی نے بڑے تکلف سے عرفیہ کے آداب بجا لایا اور عرفیہ کا ہاتھ بھی بے خیالی میں جواب کے لئے اٹھ گیا۔ رومی کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اُسے تو اچانک جنت مل گئی۔ مگر عرفیہ — ؟ اس کی زندگی منتشر لنزل ہو گئی۔

"رومی جتنے خوب صورت ہیں اُس سے کہیں زیادہ خوب صورت اُن کا مزاج ہے۔ یہ بہترین ڈانسر بھی ہیں۔ اور نو اور یہ بہت پھرتیلے ہیں۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ میں نے جہاں جہاں اپنے ڈانس

پروگرام دیئے ہیں وہاں وہاں وہ اکثر ل جایا کرتے تھے۔ ابھی پچھلے ماہ ہمارا ڈانس کنسرٹ ہانگ کانگ گیا تھا۔ وہاں یہ مسٹر اچانک مل گئے۔ پھر تو ــــ اوہ رومی ــــ میں بھول نہیں سکتی وہ تنہایں" فرطِ جذبات سے ونیتا کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ عرفیہ نے محسوس کیا کہ ونیتا کی حالت اُس ننھے بچے کی سی ہوگئی ہے جیسے اچانک دیوار پر کوئی چڑیا سیٹر گئی ہو۔ پھر عرفیہ نے دیکھا کہ ونیتا کا سر آہستہ آہستہ رومی کے سینے پر جھکنے لگا۔

"آہ ــــ رومیا ــــ رومی ــــ!" جذبات اب سرگوشی میں گھلنے لگے تھے۔

"میں نے تم کو مِس کیا رومی ــــ واقعی مِس کیا" ونیتا نے نیم باز گلابی آنکھوں سے ایک نظر رومی کی طرف دیکھا اور سر اُس کے سینے پر رکھ دیا۔ ونیتا کی اس جذبات انگیزی پر رومی بیکلخت بوکھلا گیا۔ اس نے ایک نظر عرفیہ کی طرف دیکھا جس کی پیشانی پر شبنم جھلملانے لگی تھی اور ونیتا کو پرے ڈھکیل دیا۔

"اوہ ــــ سوری رومی" میں خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ ونیتا ایک دم ہوش میں آگئی۔ مگر جوں ہی اس کی نظر رومی کی طرف اٹھی اس نے دیکھا کہ وہ پشیمان نظروں سے عرفیہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور عرفیہ خود بھی بڑی بوکھلائی ہوئی لگی تھیں۔

"ارے ــــ یہ تم دونوں کو کیا ہوگیا ــــ! عرفیہ ــــ رومی ــــ" حیران ہوکر اس نے باری باری دونوں کو پکارا۔

"اوہ ــــ مسٹر آہوجہ ــــ!!" شاید اس کی نظر کسی اور مرد پر پڑی۔

"اچھا مسٹر رومی۔ ایکسکیوزمی" بڑی بے پروائی سے وہ اُن دونوں کو چھوڑ کر ہلکی سی تاجرانہ مسکراہٹ بکھیرتی اُس مرد کی طرف چلی گئی۔

وھاٹ اے فلرٹ ــــــــــــ!!! ایک اور مرد کی کمر میں باہیں ڈالے جاتی ہوئی ونیتا کو پیچھے مڑ کر وہ بڑی دور تک دیکھتا رہا۔

"تف ہے اس لڑکی پر ــــ یوں جان کو آجاتی ہے۔ دراصل یہ لڑکی ۔ ارے ۔" اس نے اپنے اطراف نظر دوڑائی۔ مگر عرفیہ اُسے کہیں نظر نہ آئی۔ ہجوم کو چیرتا ہوا وہ ادھر اُدھر عرفیہ کو ڈھونڈتا رہا۔ اُسے لگا۔ جیسے عرفیہ نہیں بلکہ اس کی اپنی زندگی کہیں گم ہوگئی ہے وہ عرفیہ کو خوب جانتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس نے بروقت عرفیہ کے دماغ سے اندیشوں کو پاک نہ کیا تو زندگی بھر کے لئے اسے سمجھا نہ پائے گا۔ وہ جانتا تھا اس اچانک حادثے کا ــــ پچکی سی گی، ہاتھ لگی۔

عرفیہ کے دل پر کیا اثر ہوا ہوگا تب ہی تو وہ عرفیہ سے ایک بار ملنا چاہتا تھا۔ مگر عرفیہ نے شاید یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب رومی نام سے اس کی کوئی وابستگی نہیں رہی۔ وہ عرفیہ سے ملنے عدالت بھی گیا مگر وہاں انھوں نے رومی کی وہ تحقیر کی کہ کئی دن تک وہ اپنی شکل خود نہ دیکھ سکا۔

ہنستا کھیلتا کھلنڈرا اور شرارتوں کا شہنشاہ رومی ایک دم خاموش ہو گیا۔ حالات کو دوبارہ استوار کرنے کے لئے اس نے ہزار جتین کئے۔ اپنے ملازم منظورے سے اس نے معافی نامہ بھیجا مگر سب بے سود ثابت ہوا۔ عرفیہ نے تو ان چٹھیوں کو چھوا تک نہیں۔ آخر رومی کا قصور بھی کیا تھا۔ وہ مزاجاً ہی شریر تھا اور عرفیہ کے آگے تو اور بھی شریر بن جایا کرتا تھا۔ اس دن محض عرفیہ کی پریشانی سے محظوظ ہونے کے لئے اس نے اچانک رونما ہونے والے حادثے کا ساتھ دیا تھا۔ ورنہ وہ کہاں اور وینیتا کہاں —— ! عرفیہ اُس کی زندگی تھی اس کی جنّت۔ وہ اپنی فردوسِ گم گشتہ کی تلاش میں اپنی خودی کو تک فراموش کر چکا تھا۔ ایک دن تو اس نے اپنی بھاوج کو بھی عرفیہ کے گھر بھیجا کہ مفاہمت کی کوئی صورت نکل آئے مگر اس دن عرفیہ نے حد یہ کی کہ اپنے کمرے کا دروازہ تک نہ کھولا۔

عرفیہ بذاتِ خود بے حد ضدی اور انا پرست تھیں۔ بچپن ہی سے انھوں نے اپنی ضد کے سہارے اپنی ہر خواہش کی تکمیل کی تھی۔ اپنے لئے وکالت کا پیشہ تجویز کرنا بھی ان کی اسی عادت کا نتیجہ تھا۔ ورنہ تو ان کا گھرانہ بڑا قدامت پرست تھا۔

بجز اس ایک کمزوری کے وہ نہایت نیک طینت اور خدا پرست تھیں۔ بہت زیادہ پڑھی لکھی ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے آپ کو سماج کی آلودگیوں سے پاک رکھا۔ رومی ان کا بچپن کا دوست تھا۔ جوانی کی حد میں داخل ہوتے ہوتے انھوں نے بچپن کی محبت کو کسی اور رنگ میں دیکھا تو بس دل وجان سے اُسی کی ہو گئیں۔ رومی کو وہ اپنی زندگی کا انعام سمجھتی تھیں اور اُس سے بھی اتنے ہی پیار کی امید رکھتی تھیں۔ مگر۔ ۔ ۔ رومی کو اپنی نگاہوں کے سامنے ایک اور لڑکی سے فلرٹ کرتا ہوا دیکھا تو انھیں لگا کہ انھیں بھی دل وجان سے چاہنے کا وہ محض ناٹک کرتا ہے۔ درحقیقت ان کے ساتھ بھی وہ فلرٹ ہی کرتا ہوگا۔ اس کے بعد انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ کسی مرد کو منھ نہیں لگائیں گی۔ حالانکہ رومی کو بھولنا ان کے لئے انتہائی سنگین مرحلہ تھا۔ کئی بار ان کے ارادے متزلزل ہوئے۔ استقامت لڑکھڑائی کہ وہ رومی کو معاف کر دیں۔ اس کے لئے نہ سہی خود اپنے لئے۔ کیونکہ وہ رومی کے بغیر جینے کا تصور نہیں کر سکتی تھیں۔ مگر ایسے وقت اُن

کی انا آڑے آجاتی اور اُن کے پیشے کی ساکھ ان کی انا پرستی کو اور تقویت بخشتی۔ حالات کی سنگینی کا اثر ان کی دفتری زندگی پر بھی پڑا۔ ازدواجی زندگی سے علیحدگی کے لئے آئی ہوئی کئی درخواستوں کو انھوں نے ٹال کے رکھا ہوا تھا کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ناراض جوڑوں میں خود ہی صلح صفائی ہو جائے۔ اُن ساری درخواستوں میں انھوں نے طلاق کی نوٹسیں جاری کروا دیں۔ انھیں نفرت ہو گئی تھی۔ مرد ذات سے اور اس خیال سے کہ عورت بنا سہارے کے مر جائے گی۔

"اپیا ــــ اپیا۔ دروازہ کھولو"۔ عظمیٰ زور زور سے دروازہ پیٹ رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" انھوں نے جھلا کر دریافت کیا۔

"دیکھو تو کون آیا ہے ــ!" عظمیٰ نے صحن کی طرف اشارہ کیا جہاں منظورے کھڑا اپنے دانتوں کی نمائش کر رہا تھا۔

"او ئے منظورے۔ بتا کیا لے گا میرا پیچھا چھوڑنے کا؟"

"بی بی جی۔ میں حکم کا بندہ۔ کچھ لینے نہیں آیا۔ صاحب کہتے ہیں اگر اس بار انھیں چٹھی کا جواب نہ ملا تو وہ خود یہاں آجائیں گے۔

"واہ رے زبردستی ــ! آخر وہ خود کو۔ ۔ ۔" وہ جملہ مکمل نہ کر سکیں۔ دل کے کسی گوشے سے پیار کی لہر اٹھی بھی تو اُن کا انداز خود سپردگی تھا جو اُن کے دل میں کہیں کسک بن کے رہ گیا تھا۔ مگر نفرت کا جذبہ اس قدر غالب رہا کہ دل کی آواز کو زبان نہ مل سکی اور یوں۔ ایک بار پھر وہ زندگی سے ملتے ملتے رہ گئیں۔

"تم جاؤ منظورے۔ میں اس کا مزاج درست کئے دیتی ہوں"۔ اماں بی نے منظورے کو واپس لوٹا دیا اور خود ایک پھری ہوئی شیرنی کی طرح اپیا کے کمرے میں گھس پڑیں۔ عظمیٰ بھی گھبرائی گھبرائی ان کے پیچھے لپک کر اندر پہنچ گئی۔

"لڑکی ــ! تو نے اپنے آپ کو سمجھ کیا رکھا ہے ــ! بڑی افلاطون بنی پھرتی ہے۔ کچھ دیر قبل رومی کی بھاوج آئی تھیں۔ میں نے انھیں زبان دے دی ہے۔ کان کھول کر سن لے۔ تیری شادی ہوگی اور رومی سے ہوگی۔ تو نے مجھے خوب نچا لیا۔ مگر اب مجھے ہوش آگیا ہے۔ بڑا گھمنڈ ہے تجھے اپنے آپ پر۔ مگر یاد رکھ عورت کی ضد ایک دن خود اسی کے لئے آہنی شکنجہ بن جاتی ہے۔ جس دن تو یہ بیڑیاں تنگ ہوتی محسوس کرے گی بہت تلملائے گی۔ لیکن تو انھیں کاٹ نہ پائے گی کیونکہ انھیں کاٹنے والی دھار تو وقت کے ہاتھ ہوگی ــــ اور وقت ــــ بہت دور

نکل چکا ہوگا۔ خود پر نہ سہی کم از کم میری بوڑھی ہڈیوں پر تو رحم کر۔ یہ سچ ہے میں نے تجھے اپنی کوکھ سے پیدا نہیں کیا۔ اپنا خونِ جگر دے کر تجھے پالا تو ہے۔ اتنی چھوٹی سی تو چھوڑ کر مری تھی تیری ماں۔ اس بار میرا فیصلہ اٹل ہے۔ تیری شادی میری مرضی کے مطابق ہوگی۔ یاد رکھ۔"
شدتِ غم سے اماں بی کا کمزور بدن کانپنے لگا اور وہ آگے پیچھے جھولنے لگیں۔ اگر عظمیٰ دوڑ کر انھیں سنبھال نہ لیتی تو وہ چکرا کر گر پڑتیں۔ ضعیف نانی ہچکیوں سے روتی رہیں اور وہ خود پر لعن طعن کرتی رہیں۔

"آج مجھے پتہ چلا۔ میری محنت رائیگاں گئی۔ آخر کو میں تیری ماں نہ بن سکی!"
"ایسا نہ کہو اماں بی۔ خدا کے لیئے۔" اماں بی سے لپٹ کر وہ بے تحاشہ رونے لگیں۔
"کہہ دو اُس منظور رے والے کو کہ میں تیار ہوں!"
عرفیہ کے ہاں کہنے کی دیر تھی۔ سوگوار فضا لمحہ بھر میں خوشگوار ہو گئی۔ دونوں گھروں میں خوشیوں کے تبادلے ہوئے۔ عظمیٰ تیاریوں میں ایسی الجھی کہ اسے اپنا ہوش نہ رہا۔ صرف چار دن میں شادی کی تیاریاں مکمل کرنی تھیں۔ اماں بی کے ناتواں ہاتھوں میں برقی قوت آگئی تھی۔ گھر کے در و دیوار سے خوشیوں کی کرنیں پھوٹنے لگی تھیں۔ مگر۔ ۔ اتنی ساری خوشیوں میں اگر کوئی شامل نہ تھا تو وہ ـــــ خود عرفیہ تھیں۔

دن پر لگا کر اڑتے رہے۔ مگر وہ اپنی الجھن کو سلجھا نہ سکیں۔ رومی سے شادی کے لیئے ہاں کر کے انھوں نے اماں بی کی بات کی لاج تو رکھ لی مگر خود ان کی انا بری طرح متاثر ہو گئی تھی۔ جتنا وہ سوچتی رہیں اتنا ہی الجھتی رہیں، وہ پریشان تھیں کہ وہ رومی جیسے گھاگ انسان کے ساتھ کیسے نباہ کر سکیں گی۔ کتنی صفائی سے وہ اپنا اُلّو سیدھا کرتا رہا۔ خود تو فلرٹ کرتا رہا اور وہ اُس پر جان نچھاور کرتی رہیں۔ اگر وہ سیدھی سادی لڑکی ہوتیں تو شاید دُنیتا کی ملاقات کو حادثے پر محمول کر کے اسی دھوکے کے سہارے جی تو سکتی تھیں۔ مگر آئے دن ایسے ہی کرداروں سے نمٹتے نمٹتے وہ خود کو ایسے خوشگوار دھوکے میں بھی نہیں رکھ سکتی تھیں۔ سب کچھ جانتے ہوئے انھوں نے ایسا کیوں کیا ـــــ!

"اماں بی کی لاج رکھنے کے لیئے" انھوں نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دے لیا۔ مگر زندگی تو انھیں خود جینی تھی۔ پھر ـــ پھر کیا کیا جائے ـــ!!
کتنی دیر سے وہ اپنے کمرے میں بند پڑی تھیں۔ رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ لوگ مشینوں

کی طرح تیاریوں میں جٹے ہوئے تھے۔ اماں بی ڈو پٹے کا رہا سہا گوٹا مکمل کرنے میں ساری توانائی صرف کر رہی تھیں۔ عظمیٰ رت جگے کے گلگلے منہ میں ٹھونسے ادھر اُدھر دندناتی پھر رہی تھی۔ اس کی سہیلیاں اس کے ساتھ کام میں اُس کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔

"آخر اس رومی کے بچے نے اپنی دولت کے بل بوتے پر اماں بی کو خرید ہی لیا۔" غصّے میں کروٹ بدل کر وہ پھر سے نیند کو آزمانے لگیں مگر نیند اُن کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ان کے جسم میں خون کھولنے لگا۔ گھبراہٹ پر قابو پانے کے لئے وہ اب تک دو تین گلاس پانی پی چکی تھیں مگر غصہ تھا کہ اور بڑھتا ہی جا رہا۔ سونے پر سہاگہ کہ اتنے میں عظمیٰ نے اپنی ایک سہیلی کو ونیتا کہہ کے پکارا۔ ونیتا کا نام سنتے ہی اُن کا پارہ چڑھ گیا۔

"میں اس کی دولت کو سجدہ نہیں کروں گی آخر وہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔! میں دھوکہ کھا کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ یا اللہ ——! یہ میں کس جھنجھٹ میں پڑ گئی ہوں ——!" کنپٹی میں اٹھتی درد کی ٹیس سے بے قابو ہو کر انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

"میں عام لڑکیوں کی طرح اپنے آپ کو حالات کے سپرد نہیں کر سکتی ——" پھر انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ گھر والوں کو ساری حقیقت بتا دینی چاہئے کیونکہ وہ رومی سے بدستور نفرت کرتی ہیں اور نفرت وہ شدید جذبہ ہے جو دل کے نہاں خانوں میں چھپے ہر جذبے پر غالب آجاتا ہے۔ اور وہ شادی جیسے مقدس رشتے کو جس کی بنیاد ہی محبت اور وفا پر ہے ہرگز داغدار ہونے نہیں دیں گی —— انھوں نے آہستہ سے دروازے کا پٹ کھولا۔

"اُف توبہ! کیا غُل غپاڑا مچا رکھا ہے اس عظمیٰ کی بچی نے۔"

دروازے کی جھری سے انھوں نے دیکھا عظمیٰ اپنے ہاتھوں میں پھول کے گجرے باندھے ڈھولک پر بیٹھی ہے اور اس کی سہلیاں اطراف بیٹھی کسی اچھے گیت کا انتخاب کر رہی ہیں۔

"اری لڑکیو اب شروع بھی ہو جاؤ۔ کیا یوں ہی صبح کر دو گی۔" پان کی پیک کو اندر دھکیلتے ہوئے اماں جانے کسی اذان دیتے ہوئے موذّن کی طرح للکارا تو لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔

"کتنی خوش ہیں اماں بی —— اب کیا کہوں اُن سے ——! وہ یہ صدمہ برداشت کر سکیں گی۔؟ مگر رومی کے ساتھ تو میں جی نہ سکوں گی —— مر جاؤں گی۔ تو کیا وہ صدمہ اماں بی برداشت کر لیں گی —— ؟ نہیں وہ صدمہ تو اور بھی شدید ہو گا —— پھر ایسی سزا میں اپنے آپ کو کیوں دوں ——؟؟ سزا تو رومی کو ملنی چاہیئے۔ ہاں میں بدلہ لوں گی رومی سے ——

وہ بھی ایسا کہ، اس مرد کے بچے کو تاحیات یاد رہے گا کہ عورت بھی کس حقیقت کا نام ہے — اپنی تذلیل کا بدلہ لینے کا اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا — ہاں — ایسا بدلہ لوں گی کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اس کی انا ۔ جیسے میں بکھر گئی ہوں "

اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے سے قبل وہ اٹھیں اور سفید اونی شال اوڑھ کر تاریکی میں گھل مل گئیں ۔ ڈھولک کی تھاپ پر لڑکیوں کے قہقہے اور اماں بی کے چٹکلوں نے بہت ان کا راستہ روکا ۔ مگر وہ اپنی ضد پر اڑی رہیں ۔ یہی تو ان کی شخصیت کی پہچان تھی — پھر انھوں نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دے لی کہ وہ ملک چھوڑ کر تھوڑے ہی جا رہی ہیں ۔ یہ قدم تو وہ محض اس رومی کے بچے کو زک دینے کے لئے اٹھا رہی ہیں ۔

گیارہ بجنے میں کچھ منٹ اور باقی تھے ۔ وہ تیزی سے ٹکٹ گھر پہنچیں ۔ اناونسر ریل کی آمد کی اطلاع دے رہا تھا ۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی وہ پلیٹ فارم پر آگئیں ۔ اٹیچی نیچے رکھ کر انھوں نے شال کے کونے سے اپنا پسینہ خشک کیا ۔ قریب آتی ہوئی ریل کو دیکھ کر ان کے احساس و فرض میں زبردست جنگ شروع ہو گئی ۔

"اماں بی اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکیں گی ۔ کیا میں ان کی خاطر یہ نہیں کر سکتی کہ اپنا فیصلہ بدل لوں اور آہستہ آہستہ زندگی کا زہر پی لوں — ! مگر ۔ ۔ ۔ رومی تو سمجھے گا کہ عورت آج بھی متاع کی طرح خریدی اور بیچی جاتی ہے ۔ جیت آج بھی مرد کی ہوتی ہے — نہیں ۔ جیت اس کی نہیں — میری ہو گی "

ریل اب پلیٹ فارم پر رک گئی تھی ۔ لوگ ایک دوسرے کو وداع کر رہے تھے ۔

"بیٹا مجھ بوڑھی پر رحم کرنا ۔ اپنی خیریت کی کیفیت دیتی رہنا ۔ تیرے سوا اب میرا اس دنیا میں ہے ہی کون — ! مجھے بھول نہ جانا — " ایک بڑھیا آنسوؤں کے درمیاں اپنی وداع ہوتی ہوئی بیٹی سے کہہ رہی تھی ۔ اس تڑپتی بلکتی ماں کی صورت میں اسے اماں بی کا چہرہ گھومتا دکھائی دیا ۔ پژمردہ چہرہ — نڈھال اور بے بس چہرہ — آنسوؤں سے تر بتر چہرہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا — " آخر تو نے میرے منھ پر کالک پوت دی — کیا ہوا جو اپنا خون دے کر پالا — آخر میں تیری ماں نہ بن سکی "

"نہیں نہیں اماں بی " بے خیالی میں وہ بلند آواز میں کہہ گئیں ۔

" کیا نہیں نہیں محترمہ — سوار ہو جائیے ۔ گاڑی کو سگنل مل چکا ہے " گارڈ اپنی ہری جھنڈی لہراتا

ہوا گویا ہو۔ عرفیہ کی کشادہ پیشانی پر پسینہ موتیوں کی طرح جھلملانے لگا۔

"معاف کیجیے۔ آپ کچھ پریشان لگتی ہیں۔ گاڑی اب چھوٹنے ہی کو ہے"

گارڈ کی حیرانی بےجا تھی۔ سیٹی ہوئی ـــ اور۔۔۔ گاڑی سرکنے لگی۔

یہ تم نے کیا کیا ـــ کیوں کیا؟ اب کیا کروگی؟؟ ہزاروں سوال چاروں طرف سے ان پر یلغار کرنے لگے۔ دونوں ہاتھوں سے انھوں نے سر دبا لیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگیں کیونکہ ان کی آنکھوں کے آگے دھند گہری ہو رہی تھی۔ پھر انھوں نے سوچا کہ پلیٹ فارم چھوڑ دینا چاہیے۔ بڑی تیزی سے انھوں نے نیچے رکھا ہوا اٹیچی کیس اٹھا لیا اور لوٹ جانے کے لئے پلٹیں۔ لگتا تھا پلیٹ فارم کا تختہ فرش بغیر کسی نقش پا کے ان کے پیر پکڑ رہا ہے، اور گھر کے در و دیوار ان کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔

۴/ اپریل ۹۰ء

قمر جمالی

اس اوبڑ کھابڑ سی لڑکی کی اناپ شناپ حرکتوں پر اب میں جھنجھلانے لگی ہوں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے اس نے۔ یہ تو بھلا ہو اس آدم قد لہر کا کہ اسے پرے ڈھکیل کر ریت پر سلا دیا۔ ورنہ پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ یہی نہیں، ہمیشہ سے اس کا یہی وطیرہ رہا ہے۔ بات بے بات پرے پرے نکل جاتی ہے تو صدیوں یہاں وہاں بھٹکتی رہتی ہے۔ کل ہی کی بات ہے جب ہم سکندرآباد اسٹیشن پر اپنا مطلوبہ ریزروڈ کمپارٹمنٹ ڈھونڈ رہے تھے کہ یہ اچانک ہم سے الگ ہو گئی۔ اور جب ہم نے اپنا مطلوبہ کمپارٹمنٹ دریافت کر لیا اور اندر قدم رکھا تو یہ پہلے ہی سے اس میں موجود تھی۔ مجھے دیکھا تو کھکھلا کر ہنس پڑی اور نو دو گیارہ ہو گئی۔ یہ اتنی تیز گام ہے کہ ہمیشہ وقت سے پرے سفر کرتی ہے۔ ایک صدی آگے ــ یا پھر ایک صدی پیچھے۔

پچھلے سال جب ہم جےپور ٹور پر تھے اور گھومتے گھامتے شیش محل میں قدم رکھا، کہ یہ سٹراپ سے نکل گئی۔ پھر جو مَیں نے آنکھیں کھولیں تو شیش محل کے اِنچ اِنچ پر اُسی کی شبیہ اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ مہارانی سا جاہ وحشم، زربفت کا گھاگرہ، چولی، اور مُقیش کے کنارے کی اُوڑھنی میں اس کا تزک دیکھ کر میری آنکھیں ٹھہر گئیں۔ دراصل پرانے محلات کے کھنڈروں میں پہنچ کر مجھے نہ جانے کیا ہو جاتا

ہے۔!! میرے قدم رکھتے ہی کھنڈر اپنی تہذیب بولنے لگتے ہیں۔۔ اور صدیوں کی موٹی ہتہ میری پتلیوں سے چپک جاتی ہے۔ جن سے چھٹکارا پانے کے لیے مجھے بڑی جانفشانی کرنی پڑتی ہے۔

صبح جب ہم گوا (GOA) ٹور کے لیے نکل رہے تھے، تب ہی مجھے اندازہ تھا کہ آگے پیچھے صدیوں میں ڈولنے والی یہ لڑکی مجھے بڑا ستائے گی۔

ابھی ہم اپنا اسٹیٹ چھوڑ کر کرناٹک اسٹیٹ میں داخل ہوئے ہی تھے کہ ہبلی اسٹیشن سے دھارواڑ (DHARWAR) کے بیچ یکایک گاڑی رک گئی۔ اطراف سے مختلف قسم کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر یوں محسوس ہوا کہ گاڑی پر دہشت گردوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ گوا جانے والی بس بھی ایک واحد بوگی ہوتی ہے جسے آندھرا پردیش اسٹیٹ سے کرناٹک جانے والی ایکسپریس ٹرین سے لگا دیا جاتا ہے۔ کرناٹک اسٹیٹ کی حد چھوڑتے ہوئے اس بوگی کو واسکو۔ وجیا نگر ایکسپریس (VIJYA NAGAR EXPRESS) سے منسلک کر دیا جاتا ہے۔ ساری گاڑی میں چیخ و پکار کی آوازیں آرہی تھیں۔ مگر اکثریت کنڑ بولنے والوں کی تھی، اس لیے کچھ پلے نہ پڑتا تھا۔ چونکہ پورا کمپارٹمنٹ ہمارے حق میں ریزرو تھا اس لیے ابتدائے سفر ہی سے ہم نے اپنے کمپارٹمنٹ کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا، اگرچہ کھلی کھڑکیاں ہوتی تھیں۔ مگر جوں ہی گڑبڑ کا احساس ہوا ہم نے وہ بھی گرا دیں۔ اب اندر ہی اندر میں دافعِ بلا کے لیے دل ہی دل میں کلام پاک کی مقدس آیتوں کا ورد کر رہی تھی تو میرے میاں اپنے بچپن کی بہادری کے قصے یاد کر کے اپنے آپ میں طاقت اور ہمت جمع کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ تینوں بچیاں اوپر کی برتھ پر چھپکلیاں کی طرح چپک گئی تھیں۔ یکایک ہمارے کمپارٹمنٹ کا دروازہ اور زور پیٹا جانے لگا۔ میرے میاں آگے بڑھ کر چٹخنی گرانا ہی چاہتے تھے کہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا... کہ میں نے زور سے دھکا دے کر انہیں سیٹ پر بٹھا دیا یہ سوچ کر کہ اگر یہ بچ جائے تو بچیوں کا سہارا بنے رہے گا۔ مگر... جوں ہی میں نے دروازہ کھولا اور اپنے مقابل خوش باش نوجبز لڑکوں کو دیکھا تو میرا خوف جاتا رہا۔ ابھی میں اپنے حواس میں واپس ہوئی بھی نہ تھی کہ وہ، دھم سے نیچے کود گئی، میں بے اختیار دروازے تک اس کے پیچھے لپکی اور مارے گھبراہٹ کے وہیں گر گئی۔ وہ لڑکے بھی یکلخت

میرے پیچھے لوگوں کے دروازے تک آئے اور مجھے سہارا دے کر واپس میرے کمپارٹمنٹ تک لے گئے۔

"کیا ہوا آنٹی — ؟ وہ اپنی حیرانی دبا نہ سکے

" وہ — !" وہ ... گاڑی کے نیچے آجائے گی۔"

"کون — !" انہوں نے ادھر ادھر دیکھا پھر میرے شوہر سے مخاطب ہوئے۔ جو سراسیمہ یہ سب دیکھ — نہیں دیکھ نہیں محسوس کر رہے تھے۔

"ہم مخالف منڈل کمیشن گروپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ تنظیم کے لیے روپیہ اکٹھا کر رہے ہیں۔" اتنا سننا تھا کہ میں نے اپنا پرس کھولا اور سنّو روپے کا نوٹ ان کے ڈبے میں ڈال دیا لڑکوں نے شکریہ ادا کیا اور ہدایت کی کہ یہاں سے لونڈا (LONDA) اسٹیشن پار ہونے تک کھڑکیاں اندر سے بند رکھیں۔ پھر — وہ سب دھپ دھپ کرتے نیچے کود گئے۔

لڑکے جا چکے، مگر ٹرین ہلتی نہ تھی۔ باہر شور شرابہ جاری تھا کچھ منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ ہم نے سوچا کہ بم پھٹا۔ مگر نہیں ... سیٹی ہوئی اور گاڑی چل پڑی ہم نے ایک دوسرے کو چھو کر اطمینان کر لیا کہ زندہ ہیں۔

بڑی دیر بعد وہ آئی۔ بتانے لگی کہ وہ بم نہیں تھا۔ ایک زوردار پٹاخہ تھا جسے ہمارے بازو والے ڈبے میں سفر کرنے والی کرسنتان فیملی کو خوف زدہ کرنے کے لیے ان لڑکوں نے چھوڑا تھا، کیونکہ انہوں نے یہ کہتے ہوئے چندہ دینے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ ہندوستان کی "بڑی" اور "چھوٹی" ذاتوں کے بیچ کی لکیر ہیں۔ اور دونوں ہی مراعات انہیں پہلے ہی سے حاصل ہیں۔ لہٰذا وہ منڈل کمیشن سفارشات کی نہ ہی تائید میں ہیں اور نہ ہی مخالفت میں۔ اس نے بتایا کہ اس مرد کا نام ہے۔ جے کرسٹوفر ہے۔ یعنی جنگم، پلی جے رام کرسٹوفر۔

کرناٹک اسٹیٹ چھوڑنے کے تھوڑی دیر بعد تمناّئی گھاٹ سے گھاٹوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو اٹھارہ گھاٹوں سے گاڑی گزرتی رہی۔ ریلوے لائن کی دونوں طرف اتنے خوبصورت مناظر تھے کہ بار بار خدا کی شان میں قصیدہ ہو جاتا۔ کرناٹک اسٹیٹ سے گوا تک کی ریلوے لائن پہاڑوں کو کاٹ کر بنائی گئی ہے۔ اس لیے اگر گھاٹ نہ بھی ہوں تو

گاڑی وادیوں سے گزرتی ہے۔ حدِ نظر تک مخملیں ٹیلے ۔ ۔ ۔ جن پر اُڑتے ہوئے سفید ہنسوں کے سے پر پھیلائے بادلوں کے دَل ۔ بادلوں کو چیر کر ۔ یا بادلوں کے اوپر سفر کرتے ہوئے کبھی کبھی اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا احساس کچھ زیادہ ہونے لگتا تھا، کیونکہ کہرے کی وجہ سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہمارا ناطہ زمین سے ٹوٹ گیا ہے اور ہم آسمانی مخلوق میں شمار ہونے لگے ہیں۔

سونالیہ گھاٹ (SONALIA GHAT) کا معدنی پانی (MINERAL WATER). صحت کے لیے بے حد مفید سمجھا جاتا ہے۔ اکثر سیاح یہاں کا دو گھونٹ پانی پینا ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر شومیٔ نصیب کہ یہاں گاڑی صرف دو ہی منٹ کے لیے رکتی ہے۔ میرے میاں نے شاید یہ بات پہلے ہی سن رکھی تھی۔ جوں ہی گاڑی رُکی، یہ صراحی لے کر نیچے کود پڑے۔ ابھی صراحی بھری بھی نہ تھی کہ گاڑی کو کوچ کا اشارہ مل گیا۔ میری سانس اٹک گئی۔ مگر بچیوں نے یک زبان ہو کر وہ چوں چوں مچائی کہ ایک موصوف جو بہت دیر پہلے ہماری بوگی میں گھس آئے تھے ہنسنے لگے۔ موصوف کی سیاہ رنگت، موٹے موٹے ہونٹ اور آگے کو نکلی توند دیکھ کر میں نے اپنے تئیں یہ سمجھ لیا کہ غالباً یہی حلیہ گوا کا نمائندہ ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ حلیہ چاہے جیسا رہا ہو مگر گون دل کا بڑا بانکا ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر دروازے سے باہر سر نکال کر پتہ نہیں کیا اشارہ کیا کہ گاڑی پھسلنا بند ہو گئی۔ میرے میاں دوڑ کر اندر آ گئے۔ ہم سب نے مل کر ان کا شکریہ ادا کیا۔ مگر میں ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی حیرت چھپا نہ سکی کہ گاڑی نے موصوف کا اشارہ کیوں ؟ اور کیسے سمجھا ۔ ؟ انہوں نے بتایا کہ وہ ریلوے سرکار میں (VIGILENCE OFFICER) ہیں اور اس علاقے کا سارا عملہ ان کا ماتحت ہے انہوں نے اپنا نام کمال شیخ بتایا تو میں دنگ رہ گئی کیونکہ موصوف چہرے مہرے سے مسلمان تو ہرگز نہیں لگتے تھے۔ میرا ایقان تھا کہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سندھی، پارسی، گجراتی سب اپنی صورتوں ہی سے پہچانے جا سکتے ہیں، کیونکہ مذہب کی جلا بشرے کے بشرے میں، آنکھوں کی پتلیوں اور رخساروں پر، بھوؤں کے آس پاس، ہونٹوں کے دونوں طرف گالوں کی سمت بڑھتی لکیروں میں کہیں ضم ہوئی محسوس ہوتی ہے ۔ کہ ۔ ۔ ۔ اگر انسان کو یک دم ننگا، یعنی قومیت اور ملت کے واجبات سے یکسر خارج کر کے

آدم زاد کردو ۔۔ تو بھی ۔۔ پلکوں کے اٹھنے گرنے ہی سے اس کی قومیت وملت کا اندازہ ہو جائے گا ۔ مگر ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی کبھی کچھ باتیں حقیقت ہوتی ہوئی بھی عام نظریئے سے انحراف کر جاتی ہیں ۔ اسی طرح کمال شیخ صاحب کا حلیہ میرے نظریئے سے اختلاف کر گیا ۔

یوں تو ہم نے واسکو تک کا ٹکٹ ریزرو کیا تھا ۔ مگر کمال شیخ صاحب کے مشورے پر مڑ گاؤں (MARGOAN) پر، جو پرانے گوا کا ہیڈ کوارٹر ہے، اترنے کا فیصلہ کیا ۔ کمال شیخ صاحب کی مدد سے صرف پانچ منٹ کے اندر اندر اسٹیشن کے بالکل مقابل گرین ویو (GREEN VIEW) ہوٹل کے نہایت کشادہ اور آرام دہ کمرے میں پہنچ گئے ۔

گوا کا موسم (TROPICAL) ہوتا ہے ۔ لہٰذا ہماری طرح یہاں بھی جون سے سنتمبر کے درمیان بارش ہوتی ہے ۔ جب ہم مڑ گاؤں اسٹیشن پر اترے تو معمولی بوندا باندی ہو رہی تھی ۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں زوردار بارش ہوئی ۔ کچھ دیر بعد جب بادل چھٹ گئے تو ہم باہر نکلے اور رات گیارہ بجے تک سڑکوں پر یوں ہی گھومتے رہے ۔

حیدرآباد سے (۷۵) کلو میٹر دور یہ شہر اپنے آپ میں بڑا پرانا محسوس ہوا ۔ وقفے وقفے سے بارش ہونے کی وجہ زمین ویسی ہی لسلسی ہو گئی تھی ، جیسی حیدرآباد کے پرانے شہر کی ۔ ویسی ہی گنجان آبادی ، ہوٹلیں ، دکانیں ۔ مگر اس وقت دکانیں ساری بند تھیں ۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہاں دکانیں سختی سے سات بجے بند کر دی جاتی ہیں ۔

گوا اپنی طرز کا واحد ملک ہے جہاں کسی چیز پر امتناع عاید نہیں ہے ۔ لہٰذا یہاں رات کا منظر ہم حیدرآبادیوں کے لیے بڑا تعجب خیز ہوتا ہے ۔ کیونکہ یہاں شام کے دھندلکے کے ساتھ ہی قدم قدم پر شراب کی دکانیں اور بار کھل جاتے ہیں ۔ یہاں شراب کی دکانیں ہمارے یہاں کے پان کے ڈبوں کی طرح جگہ جگہ ڈھالیوں میں لگی ہوتی ہیں ۔

دیسی شراب (CASHEW PHENNY) اور (COCO NUT PHEENY) کاجو اور ناریل کی شراب لوگ آئسکریم کے گلاسوں کی طرح پلاسٹک کے گلاسوں میں سڑکوں پر کھڑے پیتے ہیں ۔ انہیں آزادانہ اس طرح پیتے دیکھ کر مجھے حضرتِ غالب بڑے یاد آئے کہ انہوں نے ادھر آنے کے بارے میں کیوں نہیں سوچا ۔ ہو سکتا ہے پر تنگالی

عملداری کی وجہ سے ان کی ہندوستانی اناحائل ہوگئی ہو. بہرکیف اچھا ہوا ورنہ

عمر مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے

والا شعر اُن سے سرزد نہ ہوتا۔!

چونکہ رات کا وقت تھا اس لیے سڑکوں پر صرف مرد ہی مرد نظر آتے تھے. اب مردوں کے رہن سہن سے کسی شہر کی تہذیب کا کیا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔!! وہی پتلون قمیص، وہی ترچھی مانگ. تہذیب کے حقیقی امین تو عورتیں ہوتی ہیں جن کے منھ میں زبان نہ بھی ہو تو ان کے پہناوے اُن کی تہذیب کی چغلی کھاتے ہیں.

بحیرۂ عرب کے کنارے (۳۷۰۲) کلو میٹر طول و عرض میں پھیلی یہ کالونی (۴۵۱) سال تک پرتگالیوں کے قبضے میں رہ کر ۱۸ ڈسمبر ۱۹۶۱ء کو آزاد ہوئی. اور دمن اور دیو (DAMAN & DEU) کے ساتھ یونین ٹیریٹیریز میں شامل کر لی گئی.

۳۰ مئی ۱۹۸۷ء کو اسے آزاد ہندوستان کی پچیسویں ریاست تسلیم کیا گیا. گوا کا پایۂ تخت پناجی (PANAJI) ہے. یہ ریاست صرف دو اضلاع پر مشتمل ہے. شمالی اور جنوبی گوا. شمالی گوا کا ہیڈکوارٹر پناجی ہے اور جنوبی گوا کا مڑگاؤں، جہاں پرانی پرتگالی تہذیب کی باقیات اب بھی موجود ہیں.

منڈوی ندی (MANDAVI RIVER) پر بسا شہر پناجی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے. یہ گوا کا نو آباد شہر ہے. تمام سرکاری دفاتر اور سکریٹریٹ یہیں واقع ہیں. منڈوی ندی کا ساحل جہاں ایک طرف تو اونچی اونچی عصری طرز کی عمارتیں سر اُٹھائے کھڑی ہیں. وہیں دوسری طرف اس کے کشادہ سینے پر پھسلتی فریز (FERRIES) ہمیں صدیوں پیچھے خوابوں کی دنیا میں لے جاتی ہیں. کہتے ہیں کہ یہ ساحل، لندن کی بندرگاہ کا نقشہ پیش کرتا ہے.

اِس ندی کے دوسرے کنارے پر ماپوسا (MAPUSA) شہر آباد ہے جہاں پہنچنے کے لیے لوگ صبح کے اوقات اپنی اسکوٹر، موٹر اور مال و اسباب سمیت فریز میں سوار ہو جاتے ہیں. یہ فریز حکومت کی طرف سے چلائی جاتی ہیں. اس میں سفر کرنے کے لیے لوگوں کو کوئی معاوضہ ادا کرنا نہیں ہوتا. دراصل یہ ایک طرح کی آبی راہ داری ہے. ویسے منڈوی ندی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ایک پل

تعمیر کیا جارہا ہے۔ ممکن ہے اس کے بعد پرتگالیوں کی رہی سہی یادیں بھی اس ندی کے آنچل سے مٹ جائیں گی۔

جس طرح فیروز آباد کے اسٹیشن پر انز و نو بیر میں کا پنج کا چھینا ناگزیر سمجھا جاتا ہے، اُسی طرح گوا کے اسٹیشن پر انز و تو ناک پر دستی رکھنا بھی ناگزیر ہے۔ ماہی گیری یہاں کا اہم پیشہ ہے۔ سڑک پر یہاں وہاں مچھلیاں پڑی دکھائی دیتی ہیں۔ جیسے ہمارے یہاں کبھی کبھی موز* کے چھلکے دکھائی دیتے ہیں۔

مچھلی گوا کے باشندوں کی مرغوب غذا ہے۔ اس لیے ہوٹلوں میں جس طرح یہاں چاول کے ساتھ دال ضروری سمجھی جاتی ہے، اسی طرح وہاں مچھلی کا سالن، جو دیکھنے میں حیدرآبادی کڑھی کی طرح ہوتا ہے۔ ہاں مگر مزہ جُدا ہوتا ہے۔ دراصل یہ سالن، ہماری حیدرآبادی کڑھی اور ماہی قلیئے کی درمیانی شکل کا نام ہے۔

گوا گھومنے کے لیے ہم نے وہاں کے محکمۂ سیاحت کی خدمات حاصل کیں۔ کیونکہ اس میں کفایت بھی تھی اور باقاعدگی بھی۔ سٹی ٹور (CITY TOUR) کی بس پنا جی شہر کی وتورسٹ ہوٹل، سے نکلتی ہیں جو منڈوی ندی کے ساحل پر آباد ہے۔

LADIES AND GENTLEMEN! NOW WE ARE PASSING BY THE BANK OF RIVER MANDAVI —

جی ہاں! یہاں گائیڈ صرف انگریزی بولتے ہیں۔ اگرچہ کہ کونکنی، یہاں کی علاقائی زبان ہے یہاں چھوٹے بڑے سب انگریزی اتنے ہی فراٹے سے بول لیتے ہیں جتنے حیدرآباد کے غیر اردو داں حضرات اردو بول لیتے ہیں۔ "یہ ڈونا پاؤلا بیچ ہے"، گائیڈ نے کہنا شروع کیا۔ بحیرۂ عرب کے کنارے پنا جی شہر سے صرف (۷) کلومیٹر دور، پرتگالی طرز کا یہ خوبصورت ساحل ہے۔ یہاں ایک خوبصورت پرتگالی مجسمہ نصب ہے، جس کے نیچے ایک بڑی پرتگالی عبارت نقش کی ہوئی ہے۔ یہی نہیں اب بھی جگہ جگہ پارکس، ریسٹوران اور بازاروں میں پرتگالی زبان میں تختیاں اور تحریریں دکھائی دیتی ہیں۔

ڈونا پاؤلا بیچ پر ایک حسین منظر گاہ یعنی (VIEW POINT) بنی ہوئی ہے

---

* عربی لفظ ہے۔ کیلے کو دکن میں موز کہتے ہیں۔

جہاں سے مرما گاؤں ہاربر (MARMA GAON HARBOUR) زاوری ندی کا دہانہ، گورنر کا محل اور پرانا اگواڈا قلعہ (AGUADA FORT) دیکھا جا سکتا ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ نوجوان لڑکے ہاتھوں میں دور بین لئے گھومتے رہتے ہیں، اور فی کس ایک روپیہ کے عوض سارے اہم مقامات دکھاتے ہیں۔

"یہ گورنر کا محل ہے۔ گورنر خورشید عالم صاحب آج کل یہیں رہتے ہیں" دور بین سے ایک طرف اشارہ کر کے لڑکے نے کہا تو مجھے گورنر خورشید عالم کی قسمت پر رشک آنے لگا۔

"پھر تو یہاں رہ کر وہ بڑا بے دین ہو گیا ہو گا۔ لب ساحل بنے اس عشرت کدے میں رہ کر اس کے دل سے جنت کی لالچ ہی مٹ گئی ہو گی۔"

وہ اچانک بیچ میں ٹپک پڑی۔

HEY ! COULD YOU HEAR ME ?

WHO STANDS THERE ?

یہ مقام سنیما والوں (CINE FIELD) والوں کے لیے ہمیشہ توجہ کا مرکز رہا ہے بمبئی بھیٹر کی مشہور فلم "اک دوجے کے لیے" یہیں فلمائی گئی تھی۔۔

یہ گائیڈ تھا جو موقع بے موقع مسلسل کچھ نہ کچھ کہنا اپنے فرائض منصبی کا ایک حصہ سمجھتا تھا۔

پناجی شہر سے صرف (۳) کلو میٹر دور میرا مار بیچ (MIRAMAR BEACH) واقع ہے۔ اسے "گوا کا سنہرا ساحل (GOLDEN BEACH OF GOA)" کہا جاتا ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا پارک (PARK) بنا ہے، جس کے وسط میں ایک پہاڑ نما مچھلی نصب ہے۔ بچے مچھلی کے منہ میں سے داخل ہو کر دم میں سے نکلتے ہوئے یوں کلکاریاں مارتے ہیں کہ گویا مچھلی کے پیٹ میں بیٹھے وہ سارا بحیرۂ عرب گھوم کر آ رہے ہوں۔ یہ ساحل ماہی گیری کے لیے نہایت موزوں ہے۔ یہاں کثرت سے شکاری کشتیاں ڈولتی دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں کی سنہری ریت اس قدر سنہری ہے کہ سونے کے برادے کا گماں ہوتا ہے۔

ویسنٹ زیویئرز چرچ (ST. XEVIER'S CHURCH) پرانے گوا کی سب سے پرانی عمارت ہے۔ یہ عمارت پرتگالی فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ اس عمارت کا سب سے

متاثر کن حصہ اس کا بلند و بالا، صدر دروازہ ہے۔ جسے اوپر تک دیکھنے کے لیے ٹوپی اتارنی پڑتی ہے۔۔۔۔،،

،،یہ سینٹ زیو ئیبر کی تین سو سال پرانی لاش ہے۔ ہر سال ۳ر دسمبر کو یہاں ایک FEAST یعنی جشن منایا جاتا ہے اور ہر دسویں سال مقدس راہب کی لاش زیارت کے لیے نیچے اُتاری جاتی ہے۔

،،میڈم! کیا آپ دیکھ سکتی ہیں۔۔۔؟

گائیڈ نے مجھے ذہنی طور پر موجود نہ پاکر پوچھا۔ دراصل بڑی دیر سے میں اپنے آس پاس ،،انسی،، کو تلاش کر رہی تھی۔ مجھے فکر لاحق ہوگئی تھی کہ کہیں وہ میرا ماریہ پچ ،، پر مچھلی مارکٹیوں پر ادھر ادھر پھدکتی تو نہیں پھر رہی ہوگی۔،

،،میڈم! آپ بھی آگے آجائیں۔،، مجھے سب سے پیچھے دیکھ کر گائیڈ نے بلایا۔ مگر جوں ہی میری نظر ممبر کے اوپر تابوت پر پڑی میں دنگ رہ گئی۔ کیونکہ ،،وہ،، وہاں موجود تھی۔

،،تم وہاں سے راہب زیو ئیبر کا صرف چکنا سر ہی دیکھ سکتی ہو۔ یہاں سے دیکھو۔ واقعی یہ راہب اپنے زمانے میں کافی اسمارٹ رہا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ آپ ہی آپ سکڑ کر ایک فٹ گھٹ گیا ہے۔

،،پتہ نہیں عزت افزائی کی یہ کون سی تہذیب ہے کہ اچھی خاصی خوبصورت یاد کو بالشت بالشت گھٹا کر مسخ کر دو۔!،، اس نے ایک تمسخر آمیز قہقہہ لگایا اور نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

سی کیتھیڈرل (SEA CATHEDRAL) گوا کا بلکہ دنیا کے بڑے کلیساؤں میں سے ایک ہے۔ اس میں پانچ بڑے گھنٹے لگے ہوئے ہیں جن میں سے ایک دنیا کا مشہور سنہرا گھنٹا (THE FAMOUS GOLDEN BELL) مانا جاتا ہے۔ یہ رومن کیتھولک چرچ ہے۔ یہاں راہبوں کے بتوں کی پرستش کی جاتی ہے۔ یہاں (۱۲) قربان گاہیں (ALTARS) بنی ہوئی ہیں۔ یہ کیتھیڈرل راہبہ کیتھرن (ST. CATHERENE) کے نام سے منسوب ہے۔ ان (۱۲) قربان گاہوں میں سے ایک قربان گاہ پر سینٹ کرسٹوفر کا بت نصب ہے۔ جس کے پیچھے ایک کراماتی صلیب رکھی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس صلیب کے نیچے سے گزر جائیں تو دلی مراد پوری ہو جاتی ہے۔

یوں تو گوا میں کلیساؤں کی بھرمار ہے مگر تورِیزم والے "سی کیتھیڈرل"، "بام جیسز" اور "سینٹ زیویئرز چرچ" ہی کو اپنے پروگرام میں شامل رکھتے ہیں، اس لیے دوسرے کلیساؤں کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

ہماری آگے والی منزل منگیشی مندر تھا۔ گائیڈ نے بتایا کہ ہندوستان کی مشہور پلے بیک سنگر لتا منگیشکر یہیں پیدا ہوئیں۔ اور یہ کہ لتا جی نے ابتدائی سنگیت کی تعلیم اسی مندر میں بھجن گانے سے شروع کی تھی۔

چھوٹی سی پہاڑی پر بنا یہ مندر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ گوا کی بستیاں اور عمارتیں اونچے نیچے ٹیلوں کو کاٹ کر بنائی گئی ہیں۔ اس لیے عمارتیں ایک سطح پر منظم نہیں دکھائی دیتیں، بلکہ بے ترتیب اونچی نیچی معلوم ہوتی ہیں۔ اسی بے ترتیبی کی وجہ سے کہیں کہیں ہل اسٹیشن کا گماں ہوتا ہے۔ زمین پتھریلی ہونے کے باوجود اس قدر زرخیز ہے کہ اندر کی لال لال زمین دیکھنے کے لیے اوپر سے گھاس کی تہہ اکھاڑنی پڑتی ہے۔ یہاں کی چٹانیں بھی عام چٹانوں سے مختلف معلوم ہوتی ہیں۔ دور سے دیکھو تو لگتا ہے کہ ہاتھ میں لیکر مل دو تو چٹان کنکری کنکری ہو کر نیچے گر جائے گی۔ مگر نہیں . . . . اتنی سخت جان ہوتی ہیں کہ ریلوے حکام نے پٹریوں کی دونوں جانب کم از کم ایک فٹ گنجائش بھی نہیں چھوڑی کہیں کہیں تو بس ریل کی پٹری ہی کے برابر چٹانیں تراشی گئی ہیں۔

انسان، گلی کوچوں میں چاہے جیسے رہا ہو، مگر عبادت گاہوں میں وہ اپنے اوپر چڑھی تہذیب کی مصنوعی عبا اتار پھینکتا ہے، اور لاشعوری طور پر اپنے آپ کو پرت

در پربت اپنے معبود کے حضور پھیلا دیتا ہے۔ منگیشی مندر، جس میں بھگوان شیوا کی پوجا کی جاتی ہے، لوگوں کی عقیدت میرے اس خیال کی تصدیق کرتی ہے۔ ہر آدمی اپنے آپ میں کتنا گمبھیر اور وزنی لگتا تھا اس قطار میں کھڑا ہوا — ایک دم کھرا اور سچا — !

یہ انسان بھی بڑا عجیب جیوان ہے — ! خود ہی مٹی گارے سے عمارت تعمیر کرتا ہے خود ہی اپنے ہاتھوں پتھر سے بت تراشتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ اپنی روح کے اندر چھپے جذبۂ ایماں کو باہر کھینچ نکالتا ہے، اور اس بت بے جان میں سمو دیتا ہے — تب کہیں جاکر اُسے خدا کی کسی قوت سے منسوب کرتا ہے۔ پھر زندگی ۔ ۔ ۔ کی مصروف ترین دوڑ سے دو چار لمحے نکال کر ۔ ۔ ۔ اپنے پاؤں چل کر ۔ ۔ ۔ اُس بت کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے۔ کاش — ! اتنا کچھ کرنے کی بجائے انسان اپنے اندر موجود ان جذبوں کو باہر ہی نہ نکالتا اور بجائے پتھروں کی عمارتوں میں قید کرنے کے انہیں اپنی روح کی بندشوں میں محصور رہنے دیتا — !! اس وقت بھی انسان اپنے آپ میں کتنا گمبھیر ۔ ۔ ورنی ۔ ۔ کھرا ۔ اور سچا ہوتا — !!!

مندر کے دامن میں بے شمار پھول بیچنے والیاں، بانس کی ٹوکریوں میں بیلا کے پھول لیے بڑا دلفریب منظر پیش کرتی ہیں، ان پھول بیچنے والیوں میں زیادہ تعداد مراٹھی عورتوں کی ہوتی ہے۔ یہاں کثرت سے بیلا کے پھول چڑھائے جاتے ہیں، جنہیں رنگین سیوتی اور سبزے سے ملا کر بڑے خوبصورت انداز میں گوندھا جاتا ہے۔ ڈھائی، پانچ دس اور پندرہ روپے کے ہار بنے ملتے ہیں، جنہیں یہ عورتیں خوبصورت سی ننھی ننھی بانس کی ٹوکریوں میں یا پھر دونے میں لپیٹ کر دیتی ہیں۔ یہ منظر بڑا دل آویز ہوتا ہے۔ میں نے بیلے کے پھول پہلی بار دیکھے تھے، سفید موٹی موٹی پتیوں والے اُن ہنستا ہنستا بشاش پھولوں کے لمس سے جو کیف اس وقت مجھ پر طاری ہوا تھا، وہ آج بھی باقی ہے۔

"لگاتا نہیں — ان کو جوڑے میں لگاتا نہیں۔ یہ تو بھگوان کے چرنوں میں ہی شوبھا دیتا منگتا۔"

میں بڑی خجل ہوئی، پتا نہیں کیسے تاثرات ابھر آئے تھے میرے چہرے پر اس وقت ابھی میں سر اٹھا کر اس پھول والی کی طرف دیکھا ہی چاہتی تھی کہ بازو سے "اُس" کے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز آئی۔ میری ندامت پر وہ بڑی خوش ہوا کرتی تھی۔ "دیکھا، چہرہ

کتنی کھلی کتاب ہوتا ہے۔۔اس کو پڑھنے کے لیے واسطوں کی ضرورت نہیں ہوتی ۔۔۔ کسی حد تک میں اس کی بات سے متفق تو تھی، مگر یکسر نہیں۔ میرا ایقان ہے کہ چہرہ کھلی کتاب تو ضرور ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی اس کے کچھ پنے ایک دوسرے سے یوں چپک جاتے ہیں کہ انہیں الگ کرنے کے لیے کسی نہ کسی واسطے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایسا واسطہ جس کے ہر لمس سے ایک ایک جھرّی کو زبان مل جائے۔

سنکری گاؤں میں پہاڑی کے درختوں میں گھرا ایک صدی پرانا شری دتہ مندر ہندوستانی فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ مندر کے سامنے صحن میں ایک بہت بڑا گول پو بلین بنا ہوا ہے جن پر مختلف جانوروں کے مجسمے نصب ہیں، اور اندر بھگوان برہما، وشنو اور مہیشور کے بُت پوجے جاتے ہیں۔ یہاں بے حساب سکھ عقیدت مندوں کو دیکھ کر مجھے تعجب ہوا، کیونکہ مَیں سمجھتی تھی کہ سکھ وحدانیت پر ایمان رکھتے ہیں، اور خدا کی ذات میں کسی کو شامل نہیں کرتے۔ گائیڈ نے بتایا کہ اس مندر سے یہ روایت جڑی ہوئی ہے کہ یہاں دماغی بیماریوں کا غیبی علاج ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ہندو فرقے کے علاوہ اور بھی لوگ یہاں اس غرض سے آتے ہیں۔

گوا میں مندروں کی بھی بہتات ہے۔ یہاں کی آبادی ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق دس لاکھ ہے، جن میں ۴۵ فیصد ہندو ہیں۔ ما باقی ۵۵ فیصد میں عیسائیوں کی اکثریت ہے۔ تیسری بڑی جماعت مسلمانوں کی ہے۔ ویسے یہاں ہر علاقے اور مذہب کے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ تہذیب پر عیسائی چھاپ اتنی زیادہ ہے کہ پہناوے سے ذات پات کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ہندو آبادی میں مرٹھوں کا غلبہ محسوس ہوتا ہے۔

گوا کی علاقائی زبان کونکنی ہے مگر یہ زبان صرف ساحلی علاقے کے ماہی گیر قبیلے میں زندہ رہ گئی ہے۔ پرانی کونکنی تہذیب کو اسی قبیلے نے سنبھال کے رکھا ہے۔ چکنی چکنی مچھیرنوں کو دیکھ کر دل میں ایک عجیب، بے ہنگم سا احساس ہوتا ہے۔ کچھ ناگوار، کچھ خوشگوار، ہو سکتا ہے۔ میں جس احساس کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہوں اس کا مجھ سے زیادہ میرے شوہر صاف طور پر اظہار کر سکیں۔

سڈول کسا ہوا جسم، چکنی گہری سانولی رنگت، اونچے رخسار اور بڑا دہانہ، کاجل لپی بڑی بڑی آنکھیں، کانوں میں ایک ایک انچ نصف قطر والی بڑی بڑی سونے کی ، با

سنہری بالیاں، بالوں کو سمیٹ کر سر سے اوپر گول جوڑا، ساری لنگوٹ کی شکل میں اڑسی ہوئی، یا پھر ۔ کھلی بھی ہو سکتی ہے۔ مگر قسم لے لو جو ذرا گھٹنوں سے نیچے اتری ہو۔ اور سینے پر پلّو ندارد ۔ بلاؤز نہایت مختصر، بس اتنا ہی جتنی ضرورت ہو۔ پتا نہیں، کونکنی عورتیں پلّو کیوں نہیں نکالتیں ۔ ! یا پھر ان کی تہذیب میں اس کی ضرورت ابھری ہی نہیں کہ عورت ہو تو عورت پن کا احساس باقی رہے۔ شکاری کشتیوں میں ہوں کہ مارکٹ میں مچھلی بیچ رہی ہوں، کونکنی عورتیں واقعی بڑی صاف ستھری، نکھری، ڈھلی، کچھ تو مغرِبی خوشبو سے معطر ہوتی ہیں... نظر بھر کے دیکھو تو کیف چھا جاتا ہے ۔ مگر... جب بولنے لگیں،... تو لگے گا کہ دیسی کھڑا پی کر سیکل چلا رہے تھے کہ جھٹک کر گرا دیئے گئے اور سات طبق زمین میں دھنسا دیئے گئے۔

میں نے سوچا کہ اگر ان کے منھ میں زبان نہ ہوتی، تو یہ عورتیں سنگِ سیاہ کی بہترین مورتیاں معلوم ہوتیں۔ ان کی مادری زبان کونکنی ہوتی ہے مگر ہم جیسے غیر زبان لوگوں سے یہ انگریزی میں ایسے ہی بول لیتی ہیں جیسے میں نے پہلے ہی کہہ دیا۔

محکمہ سیاحت کے حکام شمالی اور جنوبی گوا کے علاحدہ علاحدہ پروگرام منتخب کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سارے مندر، کلیسا اور تمام ساحل تسلسل سے نہیں دکھاتے صرف سمت کا تعیّن کرتے ہیں اور متعینہ راستے میں جو بھی مقام قابلِ دید ملے دکھا دیئے جاتے ہیں۔

کولوا بیچ (COLVA BEACH) پر لہریں بڑی سرکش ہوتی ہیں۔ لہروں کے تھپیڑوں سے ساحل پر دس گز دور کھڑا آدمی بھی قدِ آدم بھیگ سکتا ہے۔ یہ سچ ہے ! سمندر کے کنارے زندگی کتنی سمٹ جاتی ہے اور وقت کتنا تنگ ہو جاتا ہے، اس کا اندازہ تو اسے جھیل کر ہی ہوتا ہے ۔!!

میں نے اپنے آپ کا تجزیہ کرنے کے لیے اپنا سر جھکایا، اور آنکھیں میچی ہی تھیں کہ گریبان سے سر نکال کر ٹمٹماتی آنکھوں سے اُس نے پوچھا،... کیا تمہیں ایسا نہیں لگ رہا ہے کہ کاش ہمارے پاؤں زمین کی بجائے سمندر کی لہروں پر ٹکے ہوتے۔ اور ہم ۔ دور تک سمندر کے سینے پر ڈولتے رہتے، سورج کی سنہری کرنیں ہمارے کس بل سدھارتیں، ۔ چاندنی میں لپٹی، روپہلی لہریں لوریاں سناتیں، لڑکھڑاتے

قدموں سے جب اپنا ہی بوجھ سنبھالے نہ بنتا تو زمین پر ہونے والے استقامت اور سالمیت کے جھمیلوں سے دور۔ اس خون خرابے سے تو پاک رہتے۔" کبھی کبھی اس او بڑ کھابڑ لڑکی کی زبان دانشوری کے تابڑ توڑ حملے کرتی ہے۔

کلنگوٹ بیچ (CALANGUTE BEACH) تک پہنچتے پہنچتے لہریں سنجیدہ ہو جاتی ہیں، یہاں ساحل پر دور دور تک بڑے بڑے گُنڈ[1] سر نیوڑائے کھڑے ہیں، جن کے گنجے سروں پر چیل کوے کی طرح بیٹھے سیاح شام کے دھند لکے میں بڑے پر اسرار لگتے ہیں۔

گوا در اصل ساحلوں کی سرزمین ہے، اور کلنگوٹ بیچ کو ساحلوں کی رانی (QUEEN OF BEACHES) کہا جاتا ہے۔ یہاں کی تفریح گاہ (HOLIDAY RESORT) غیر ملکی سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ ساحل پر دور تک جھونپڑے بنے ہیں، نرم ملائم ریت پر ادھر ادھر ننگے غیر ملکی سیاحوں کو لیٹا ہوا دیکھ کر دل میں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ انہیں اب بھی اس مٹی سے کتنا پیار ہے۔

"NUDISM PROHIBITED" گائیڈ نے ایک تختی کی طرف اشارہ کیا۔ گوا میں جہاں کسی چیز پر امتناع نہیں ہے وہاں برہنگی پر ہی کیوں ۔ یہ خیال اب میرے ذہن میں آیا ہی تھا کہ گائیڈ نے پھر کہنا شروع کیا۔

"یہ انجونا بیچ (ANJUNA BEACH) ہے، اسے ہپیوں کی جنت (HIPPIES PARADISE) بھی کہا جاتا ہے۔ کچھ سال قبل مغرب میں جب ہپی ازم کی لہر چل پڑی تو کئی غیر ملکی ہپتیز ادھر ہی آبسے۔"

کیا خاص بات ہو سکتی ہے، ریت البتہ سونے میں نہا کے آئی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے سوچا اور جلدی جلدی اپنے جوتے اتارے اور ننگی پاؤں جلتی ہوئی لوہے کے جنگلے کے کنارے کنارے ساحل کی طرف اندر بڑھنے لگے۔

"آپ اُدھر نہیں جا سکتیں۔" گائیڈ نے تنبیہہ کی۔
"ننگے سیاحوں کے ساتھ عام آدمی کے لیے بھی ادھر داخلہ منع ہے۔"

---

[1] دکن میں گول گول بڑی بڑی چٹانوں کو کہتے ہیں۔

گائیڈ نے اکڑ کر کہا تو مجھے بڑا تاؤ (NUDITY IS BANNED) آیا۔ میں نے جواب میں کچھ کہنے کے لیے منھ کھولا ہی تھا کہ پاس ہی کھڑی وہ پھلجھڑی ٹھیں ٹھیں کرنے لگی۔ اس کی اِس بے موقع مداخلت پر میں جز بز ہو گئی، اور تائید کرنے کے لیے اس کی طرف دیکھا تھا اس نے ایک سمت کو اشارہ کیا جہاں کئی ننگے اجسام، کیچوؤں کی طرح پڑے تھے۔

"NUDITY اِدھر تو منع نہیں ہے۔!" اُس نے کہا اور اچھلتی کودتی لہروں میں غائب ہو گئی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے گائیڈ کی طرف دیکھا، تو گائیڈ جھینپ گیا "اب ہماری آگے والی منزل مرما گاؤں ہاربر (MARMAGAON HARBOUR) ہے۔"

(HE IS A VERY SMART MAN) میں نے دل میں سوچا۔

مرما گاؤں ہاربر، ہندوستان کے مغربی ساحل پر ایک قدرتی بندرگاہ ہے۔ یہ ہندوستان کی دوسری بڑی کوسٹل لائن ہے۔ یہ بندرگاہ واسکو۔ ڈ۔ گاما شہر سے صرف (۴) کلومیٹر دور واقع ہے۔ بیرونی تاجر یہاں مختلف اشیاء بیچتے نظر آتے ہیں، اور ساتھ ہی دیسی تاجر، دیسی مال پر بدیسی لیبل لگا کر سیاحوں کی جیب ہلکی کرتے ہیں۔

یہ بندرگاہ ایک طرح سے بحری فوجی چوکی ہے۔ اس لیے وقت واحد میں تین چار بڑے بڑے جہاز ساحل پر ٹھہرے ہوتے ہیں اور بحری فوجی افسر اِدھر اُدھر پھیلے دکھائی دیتے ہیں۔ بندرگاہ کے اندر داخلہ منع ہے۔ ہاں مگر اونچائی پر ایک RESORT بنا ہے۔ سیاح بس وہیں تک جا سکتے ہیں۔

گوا کی دو بڑی اور اہم صنعتیں ہیں۔ ایک تو مچھلی برآمد کرنا اور دوسری خام لوہا نکالنا یہاں بڑی مقدار میں لوہے کی کچ دھات دستیاب ہوتی ہے۔ منڈو نام کا ایک تاجر یہاں کے ایک لوہے کی کان کا مالک ہے۔ گائیڈ نے بتایا کہ بمبئی تھیٹر کی فلم "کبھی کبھی" کی فلم بندی اسی کان میں ہوئی۔

بیرونی طور پر گوا، ایک طرف مارما گاؤں ہاربر کی وجہ پانی کے راستے دنیا سے وجڑا ہے، تو دوسری طرف ڈوبلن ایرپورٹ (DOUBLING AIRPORT) ہوائی راستوں سے اسے دنیا کا سمبندھی بناتا ہے، اور اندر کی طرف بے شمار ندیاں :-

تیراکول (TIRACOL)، چاپورا (CHAPORA)، منڈوی (MANDVI)، زاوری (ZAVRI)، سال (SAL)، تال پونا (TAL PONA)

اور نہروں:۔
مائم (MAEM) اور کیارم بولم (CARAM BOLIM) کی موجودگی سے اس کے سینے پر آبی راستوں کا جال سا بن گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ ساری ندیاں کشتی رانی کے لیے موزوں ہیں۔

دودھ ساگر واٹر فال (DUDH SAGAR WATER FALL) ایک ایسا آبشار ہے جو دنیا بھر کے سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ دار لخلافہ سے (۶۰) کلومیٹر دور۔۔ ریلوے لائن سے جڑا، مڑگاؤں سے واسکو جاتے ہوئے کولم (COLEM) ریلوے اسٹیشن سے (۱۰) کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ گو کہ یہاں کوئی باقاعدہ اسٹیشن نہیں ہے۔ پھر بھی ریلوے حکام کی ہدایت پر چند منٹ کے لیے ریل گاڑی یہاں رکتی ہے۔ سیاح تو اترتے ہی ہیں، مگر مسافر، جنہیں اترنا نہیں ہوتا۔ ان کی خوشی بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ کیا بچے۔ کیا بوڑھے، ٹرین کے رکتے ہی سب دھڑا دھڑ نیچے کود جاتے ہیں۔

سینکڑوں فٹ کی بلندی سے گرتا ہوا، یہ آبشار دودھ کا سا سفید تو ہوتا ہی ہے مگر، اپنے اطراف میل ڈیڑھ میل کی دوری تک سورج کی سنہری کرنوں کی زد پر ایک زرّین ہالہ تعمیر کر لیتا ہے۔ سنہری ہالے کے بیچ سے گرتا ہوا دودھ سا سفید آبشار ہزاروں سال پرانی اساطیری کہانیوں کی جل پری معلوم ہوتا ہے۔ جس کے دونوں پروں پر آفاقی ہیولے اور پیروں میں گھنگرو بندھے ہوتے ہیں۔ فضا میں دور تک اس کے آنچل کی سرسراہٹ دھیمے سروں میں ایک مدہوش کن راگ باندھ لیتی ہے۔

نیچے پہنچتے پہنچتے جہاں آبشار، نہر کی صورت سکوت اختیار کر لیتا ہے بے حساب سیاح پانی میں چت پڑے ہوتے ہیں۔

دودھ کے سائبان تلے جَل جَل بہتے پانی کے بچھونے پر لیٹے ہوں، اور سورج کی سنہری کرنیں احساس کو گدگدا رہی ہوں، تو زندگی کے کتنے ہی اسرار از خود کھل جاتے ہیں۔۔ یہ میں نے پہلی بار محسوس کیا۔

گائیڈ نے بتایا کہ یہاں تین (WILD LIFE SANCTURIES) بھی ہیں
بانڈلا (BONDLA) کوٹی گاؤں (COTI GAON) اور مولم (MOLEM) میں
مگر ۔۔ "ایک بار جو کسی نے حیدرآباد کے نہرو زوالوجیکل پارک کی WILD LIFE
دیکھ لی ہو، تو اسے یہاں وہاں دیکھنے کے لیے کیا رہ جاتا ہے ۔" گائیڈ نے کہا تو
میں نے جھک کر اپنے جامے کی گنجائش کا جائزہ لیا۔

کمال شیخ صاحب نے ہم کو کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ چلو اس بہانے یہاں کی
تہذیب سے باضابطہ معانقہ ہو جائے گا، ہم نے سوچا۔

"آداب عرض ہے ۔۔" ہاتھ اٹھا کر سلام کرتی ہوئی مسز کمال شیخ نے ہمیں دروازے
پر ہی اپنے پن، کا ثبوت دیا۔ انہوں نے اپنا نام وغیرہ، بتایا تو میں نے اپنے دل میں
اُسے صغیرہ، تسلیم کر لیا۔

مسز شیخ ہماری ہی طرح ساڑی بلاؤز پہنی ہوئی تھیں۔ ہاں مگر بالوں کو خاص گوون
انداز سے اوپر اٹھا کر جوڑا سا بنا لیا تھا۔ اونچے رخسار اور بڑا دہانہ شاید گوا کی پیدائش کا
خاصہ ہے۔ پھر بھی اس صفت کو عمومی تو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ کچھ لوگ گوون ہونے
کے باوجود سانولے اور پیارے تھے۔

کمال شیخ صاحب کا خاندان خاصہ (INDIANISED) تھا۔ وہی ٹیبل
کرسی، وہی پکوان۔ یہاں ہمیں کوئی گوون ڈِش نصیب نہیں ہوئی۔ پھر بھی مرغ کا قورمہ
حیدرآبادی رنگ پیدا نہ کر سکا۔

اس دن کمال شیخ صاحب کے مکان پر ان کے چھوٹے چچا زاد بھائی قادر شیخ
صاحب آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے دوسرے دن ہمیں کھانے پر بلایا۔

قادر شیخ صاحب کا مکان، واسکو، میں مارما گاؤں بندرگاہ کو آنکھیں دکھاتا۔
پہاڑی سلسلے پر، ناریل اور سپاری کے درختوں کے بیچ، ہل اسٹیشن پر کسی کاٹیج کی طرح
تھا۔ قادر شیخ صاحب کے والد والدہ، بھائی بھاوج، مسز قادر شیخ اور بچے سب ہی
خلوص کے پتلے تھے۔ ان کی والدہ کو ساڑی پر کرتا پہنے دیکھ کر مجھے اپنی اماں یاد آگئیں۔

یہاں جو ضیافت ہوئی، شاید وہ گوون تہذیب کی متقاضی تھی، ہمارے پہنچتے
ہی قادر شیخ صاحب کا وہ گلاس بھر بھر کے ناریل کا ٹھنڈا پانی پلانا ــــ چینی کی بڑی

اُجلی اُجلی رکابیوں میں ناریل ملائی کھلانا — اور مسز فادر شیخ یعنی عائشہ بی بی کے ہاتھوں بنا وہ لذیذ مچھلی کا سالن، تلی ہوئی مچھلی، موٹے چاول کا خشکہ (یہاں صرف موٹے چاول ہی پیدا ہوتے ہیں، اور چاول گووَن کی مرغوب غذا ہے) ساتھ میں ناریل کی مٹھائی جو کیک کی طرح بیک (BAKE) کی ہوئی تھی۔ پھر چائے اور پان پیش کرنا ہمیشہ یاد رہے گا۔

کمال شیخ صاحب کے مکان پر باتوں باتوں میں مَیں نے پوچھا کہ — "اب جبکہ وہ پرتگالی چنگل سے آزاد ہیں کیا محسوس کرتے ہیں۔؟"

کمال شیخ صاحب ایک لمحہ سوچتے رہے۔ پھر کہنے لگے — "آزادی کسے پیاری نہیں ہوتی — مگر جو تحفظ پرتگالی عملداری میں نصیب تھا، اب نہیں ہے۔ اگرچہ کہ قانون وہی نافذ ہے۔ پھر بھی — آف دی ریکارڈ (OFF THE RECORD) کچھ بدل ضرور گیا ہے۔ باوجود اس کے .... انہوں نے کالر چڑھا کر کہا — "آج بھی ہم بہ فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ابھی تک یہاں ایک بھی قتل نہیں ہوا، نہ چوری ہوتی ہے اور نہ غنڈہ گردی۔ حالانکہ یہاں کسی چیز پر امتناع نہیں۔ شراب چائے کی طرح پی جاتی ہے، مگر لوگ خود پر قابو رکھنا جانتے ہیں۔

یہاں کے قوانین بڑے سخت ہیں۔ ایک ناریل چُرانے کے عوض (۱۳) سال کی قید ہو سکتی ہے۔ ایک زمانہ تھا ہم اپنے گھروں کے دروازے بند نہیں کرتے تھے۔ مگر اب.... کرناٹک سے روزگار کی تلاش میں آنے والوں کا تانتا بندھ گیا ہے۔ گوکہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا — پھر بھی — اجنبیوں کو اپنے صحن میں دیکھ کر ایک بے چین سا احساس تو ہوتا ہی ہے۔"

انہوں نے بات ختم کر کے سانس ٹھنڈی چھوڑی، تو مجھے آج کے ہندوستان کے بے حساب درد یاد آ گئے۔ پھر بھی میں نے اپنا شک سوال کی شکل ان پر داغ ہی دیا۔

"WE LOST NINTY NINE AND ACHIEVED ONE INDEPENDENCE"

کمال شیخ صاحب نے جواب میں کہا تو مجھے لگا ابھی وہ اس موڈ سے آزاد نہیں ہوئے ہیں، اس لیے یہ پوچھنا میں نے مناسب نہ سمجھا کہ وہ کون سے (۹۹) مضمرات ہیں جنہیں کھو کر

انہیں ایک آزادی ملی۔ پھر بھی وہ خوش نہیں۔ اور ہوتے بھی کیسے ۔۔۔! یہ ان کا تنہا کرب نہیں، یہ سارے ہندوستان کا کرب ہے۔

"بھائی صاحب! یہ تو دراصل غلامی کی نوعیت ہے، اور ایسی غلامی جس کے تصور ہی سے تخیل کی بو آتی ہے ۔۔۔ نفرت شدید ہو جاتی ہے۔ کیونکہ آج ہم غیر قوم کے غلام نہیں کہ بے دردی سے پنڈ چھڑا لیں۔ آج ہم ۔۔۔ اپنی ہی قوم ۔۔۔ کے غلام ہیں۔ آج اپنے چولھے ۔۔۔ سے اٹھنے والی آگ ۔۔۔ سے ہمارا کھانا کم پکتا ہے ۔۔۔ اور ۔۔۔ جگر زیادہ جلتا ہے۔"

مسز صغیرہ شیخ اپنی گود میں ایک بہت ہی چھوٹی لڑکی کو اٹھائے پھر رہی تھیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ اس عمر میں ان کی اتنی چھوٹی بچی ۔۔۔! انھوں نے شاید میری آنکھوں کی تحریر پڑھ لی تھی۔ یا پھر میرا چہرہ ہے ہی اتنی کھلی کتاب کہ تصور کے ساتھ ہی احساس کے پنّے کھڑکھڑانے لگتے ہیں، اور تحریر کھل جاتی ہے۔

"یہ میری چھوٹی سالی کی لڑکی ہے۔ اس کی ماں کی شادی میں نے ہی کروائی تھی۔ وہ یہاں کی سرکار میں ملازم ہے۔ اس لیے اس لڑکی کے پیدا ہوتے ہی صغیرہ نے اسے گود لے لیا۔ اب یہ اپنی ماں کو آنٹی کہتی ہے اور صغیرہ کو ماں۔"

کھانے کے دوران انھوں نے اپنی سالی کی شادی کی ویڈیو فلم دکھائی۔ اور باتوں باتوں میں ایک عجیب بات یہ بتائی کہ وہاں شادی کے معاملے میں مسلم پرسنل لا لاگو نہیں ہوتا۔ لا آف دی لینڈ [illegible] چلتا ہے۔ اور یہ کہ، قانون اتنا سخت ہے کہ کوئی بھی مرد ایک بار شادی کر کے اپنی عورت کو طلاق نہیں دے سکتا۔

شادی کی رسوم میں کوئی خاص فرق نہیں تھا سوائے اس کے کہ دلہن گھونگھٹ کھینچ کر اندھی بنا کر [illegible] نہیں بنا جاتی۔ رسوم پر کرشنا کا چھاپ [illegible] ہے۔

دلہن کے ساتھ دو [illegible] گرلز ہوتی [illegible] اسی طرح دولہا کے ساتھ دو چھوٹے لڑکے بھانجے یا بھتیجے بھی [illegible] جنھیں ہمارے یہاں شاہ بالا کہا جاتا ہے [illegible]

[illegible] رسم ہے یعنی

(FORMALITY) ورنہ اصل شادی تو ایک دن پہلے ہی رجسٹریشن آفس میں ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہاں رجسٹریشن کے بغیر شادی مکمل نہیں سمجھی جاتی۔،،

میں حیران تو تھی مگر خاموش سنتی رہی، وہ، پتا نہیں اتنی دیر کہاں تھی کہ یکایک دھم سے بیچ میں کود پڑی اور زور سے ہنسنے لگی۔ مسز کمال شیخ دیوانوں کی طرح میری صورت تکنے لگیں۔ میں بڑی شرمندہ ہوئی۔ مگر بے بس تھی۔ کیونکہ اس نابکار سے پیچھا چھڑانا میرے بس میں نہ تھا۔ ،، اب یہ دیکھیں،، اس نے لال مخمل سے ڈھکی ایک سینی مسز شیخ کے ہاتھوں میں تھما دی۔

مسز شیخ ایک کلیدی گڑیا کی طرح سینی لے تو لیں، مگر آگے کیا کرنا چاہیئے جانتی نہ تھیں۔ انہیں حیران دیکھ کر میں نے ہی سینی پر سے سرپوش ہٹایا۔ نیچے ہیرے کی طرح جگ مگ کرتا مصری کا کوزہ رکھا تھا۔ جس میں چاندی کے ورق میں لپٹے بادام پستے بھرے تھے۔ مسز صغیرہ شیخ نے بڑی حیران نظروں سے میری جانب دیکھا۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے منھ کھولا ہی تھا کہ اس نے آگے بڑھ کر سارے بادام پستے سینی میں الٹ دیئے۔

،، اسے مصری کا کوزہ کہتے ہیں۔،،

صغیرہ شیخ اسے بڑی چاہت سے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگیں۔

،، ہماری تہذیب کے مطابق، شادی سے ایک دن قبل ہمارے یہاں سانچق کی رسم ہوتی ہے۔ دولھا والے، دولھن کے لیے کپڑوں اور دوسری سوغات کے ساتھ ان کوزوں میں خشک میوے بھر کر لاتے ہیں۔ اب آپ اسے بھی کھا سکتی ہیں۔،، ،، اسے توڑ دیں — اتنی نادر چیز —!! ہم اسے سنبھال کر رکھیں گے۔،،

صغیرہ شیخ ایک دم بپھر گئیں۔

،، یہی تو ناممکن ہے۔ وقت کی دھول اس کے جگمگاتے پہلوؤں کو داغدار کر دیگی۔ اور — شاخ نبات اس کی متحمل نہ ہو سکے گی۔،، پھر اس نے اتنی زور کا قہقہہ لگایا کہ ایک چھناکے کی آواز ہوئی — اور، وہ، فضاؤں میں گھل مل گئی۔

بھرتری ہری اُردو میں

اَرمُغانِ سَنسکِرت

رگھُوناتھ گھئی

(۱)
مناجاتِ شنکر

جن کے ماتھے کا ہے گہنا چودھویں کا ماہتاب
ذکر ہی سے جن کے مِٹ جاتا ہے بدکاری کا نام
اِک نظر سے جن کی جل کر مَر مِٹا تھا کام دیو
ایسی شمعِ نورِ شوجی کو مرا جھک کر سلام

(۲)
ہوس کی آگ

در بدر کی خاک چھانی، ہر ولایت میں گیا
حرص زر میں اپنی عزت آبرُو تک بیچ دی
عُمر بھر بدخو لیئموں کا رہا خدمت گزار
عُمر بھر دِل کو ہوس کی آگ تڑپاتی رہی

(۳)
لالچ کا نتیجہ

دُور دیشوں میں گیا، ہمراز خویشوں میں رہا
جستجو میں زر کی کھودا کوہساروں کو کبھی
جا کے مَرگھٹ میں بھی جپ تپ میں گزُارے رات دن
پھر بھی تسکیں مل نہ پائی زر کے ماروں کو کبھی

(۴) ذلالت

تلخ جملے سُن کے بھی خاموش رہ جاتا ہوں مَیں
دِل میں روتا ہُوں مگر چہرے سے مُسکاتا ہوں مَیں
یاوہ گویوں سے بھی ہوتا ہُوں بہ عزت ہم کلام
زر کی خاطر ہر ذلالت کو روا پاتا ہوں مَیں

(۵) اگیان

گُل پہ شبنم کی طرح ہے ایک پل یہ زندگی
ایک پل جینے کی خاطر ہر گنہ کرتا رہا
بیچ ڈالا چند ٹکڑوں کے لیے اپنا ضمیر
اور خُدا سے بے نیازی کا گِلہ کرتا رہا

(۷) حسرتیں

بے غَرض جپ تپ عقیدت سے ہی ملتی ہے جزا
ہو صلے کی چاہ تو نیکی میں کچھ نہیں
فطرتاً مرغوبِ کارِ نیک ہیں دِل کو اگر
تُو وَلی ہے تجھ کو جو خواہش صلے کی کچھ نہیں

(۶) صلے کی چاہ

مِٹ چُکے ہیں ہم مگر ہیں حسرتیں دِل میں ابھی
ہے جواں حرص و ہوس گو زِندگی کی شام ہے
وقت خود مِٹتا نہیں ہم کو مِٹا دیتا ہے یہ
زندگی اِنسان کی حرص و ہوس کا نام ہے

(۸) لالسا کی آگ

دورِ پیری، لاغری، ناطاقتی، موُئے سپید
جھُریاں، کمزور بینائی، سماعت ناتواں
دِل میں لیکن کروٹیں لیتی ہیں اب بھی حسرتیں
لالسا کی آگ کی شِدّت ابھی تک ہے جواں

۹
گیان کا امرت

گیان کے امرت سے مِٹ جاتی ہے دِل کی تشنگی
حرص کا غلبہ وگرنہ کِس کو تڑپاتا نہیں
سورگ میں راجہ ہے اِندر دیوتاؤں کا مگر
وہ بھی حرص و آز کی آتش سے بچ پاتا نہیں

۱۰
جیون کا موہ

اب کہاں وہ محفلیں، وہ شوق، وہ جام و طعام
دَورِ پیری لاغری ہے جسم و جاں لاچار ہے
ڈر سے پھر بھی کانپتے ہیں سُن کے مرجانے کا نام
آدمی کو اِس سڑے جیون سے کتنا پیار ہے

۱۱
آشا نراشا

رات دن آشا نراشا میں گزاری زندگی
ہر نئی حرص و ہوس جاں کو جلاتی ہی رہی
ہو نہ پائی کیوں سکونِ قلب کی کوئی سبیل
بے قراری، ناامیدی دِل دُکھاتی ہی رہی

۱۲
کامنا چکر

کام کر نیکی کا، ثمرے کا نہ رکھ دِل میں خیال
چاہ ہو ثمرے کی تو نیکی بھلا کِس کام کی
کر کے نیکی ڈال دے دریا میں ہو کر بے نیاز
چار سُو پھیلے گی خُوشبُو خُوب تیرے نام کی

۱۳
زندگی کی کشاکش

یہ کشاکش زندگی کی، دَھن کی رنگینیاں
چھوڑ دے غافل اِنھیں یہ چار دِن کی بات ہے
تو نہ چھوڑے گا تو آخر چھوڑ دیں گے یہ تجھے
چار دِن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے

(۱۴) عَیش و عشرت

اہلِ دانش کے لیے آساں ہے ہر کارِ عظیم
عَیش و عِشرت میں کبھی وہ دل کو اُلجھاتے نہیں
ہم کہ رہتے ہیں سدا بس جُستجُو میں عیش کی
عُمر بھر کارِ نمایاں کُچھ بھی کر پاتے نہیں

(۱۵) پکشی اور انسان

ہم سے بہتر ہیں یہ پنچھی یہ نواسی دشت کے
جوگیوں کی آنکھ کے آنسو جو پیتے ہیں مُدام
ہم کہ رہتے ہیں سدا بدمست کیف و رنگ میں
بیت جاتی ہے ہماری عُمر بے نیل مرام

(۱۶) طمع

ایک گُدڑی، جامِ گِل، نانِ جویں، سادا لباس
اِس سے بڑھ کر اور جینے کو بھلا کیا چاہیے
آدمی کی حرص کی لیکن نہیں کُچھ انتہا
کس کو ہے معلوم اِس کو اور کیا کیا چاہیے

(۱۷) عورت اور شاعر

بانس کی گانٹھوں کو کہتے ہیں وہ سونے کے کلس
تھوک سے پُر مُنہ کو کہتے ہیں درخشاں ماہتاب
جسم کی بدبُو میں اِن کو بوئے مے کی مستیاں
اور پسینے کی کثافت، کیف و لُطفِ بے حساب
ہیچ ہے عورت مگر تُف شاعروں کی عقل پر
اِس کے اِک اِک عُضو میں پاتے ہیں حُسنِ لاجواب

(۲۰) جُستجُو

زِندگی تیری ہے گر حرص و ہوس، جام و طعام
نفس سے آلودہ ہے تو کیا ہے تیری زِندگی
کیا کبھی سوچا ہے غافل! زیست کا مقصد ہے کیا
بے روِش، بے مُدعا، یوں ہی گنوا دی زِندگی

(۲۳) پیٹ کی آگ

بھوک کمزوری ہے انساں کی نہیں جس سے فرار
بھوک دے کر آدمی کو کر دیا زار و نزار
بھوک سے مجبور انساں کا نہیں کوئی ضمیر
بھوک سے مجبور انساں ہر ذلالت کا شکار

(۲۴) رُسوائی

مانگنا ہی گر ضروری ہے، تو مت اپنوں سے مانگ
ہاتھ مت پھیلا کبھی اپنوں کے در کے سامنے
خاک میں مل جائے گا تیرا وقارِ علم و فن
یہ تجھے رسوا کریں گے ہر بشر کے سامنے

(۲۵) بن باس

چھوڑ کر گنگا کی لہروں کا یہ مستانہ خرام
اور ہمالہ کی حسیں، سرمست، دل کش وادیاں
چھوڑ کر بھرپور میووں سے لدے پیڑوں کے جھنڈ
گونجتی ہر سُو فضا میں پنچھیوں کی بولیاں
مست جھرنوں کی صدائیں لوریاں گاتی ہوئی
دامنِ کہسار میں پھیلی ہوئی ہریالیاں
کیوں بھٹکتا پھر رہا ہے چند سکّوں کے لیے
زر کے لالچ میں ذلیل و بے کس و بے خانماں

(۳۰) صبر و سکون

ہے سکونِ قلب کی دولت اگر حاصل تجھے
دہر کے سامانِ عشرت ہیچ ہیں تیرے لیے
صبر دے کر تجھ کو رازق نے سبھی کچھ دے دیا
قصر و ایواں، مال و دولت ہیچ ہیں تیرے لیے
دے بھی دے تجھ کو ہزاروں گر وہ سونے کے پہاڑ
کچھ نہ ہوگی ان کی وقعت ہیچ ہیں تیرے لیے

(۳۱)

مُبارک ہیں وہ لوگ

ہیں مُبارک دَہر میں وہ لوگ جو آزاد ہیں
بے نیازانہ گزُر جاتی ہے جن کی زِندگی
دُکھ نہیں دیتی اِنھیں خواہش کوئی، حسرت کوئی
بیت جاتی ہے پرستِش میں ہی ان کی زِندگی

(۲۹)

حماقت

اس گپھا میں خود پہ ہنستا ہوں جب آتا ہے خیال
کیا تھی وہ پہلی مری حرص و ہوس کی زِندگی
کس قدر بد بخت تھی، محتاج تھی، کتنی حقیر
زر کی خاطر کس قباحت میں گزاری زِندگی
اِس فقیری میں ہے حاصل مجھ کو شاہوں کا جلال
چار سُو پیشِ نظر ہنستی تھرکتی زِندگی

(۲۸)

جنگل اور شہر

جنگلوں میں ہیں مُہیا چار سُو رعنائیاں
شیت جل پینے کو، کھانے کو ہیں پھل میٹھے لذیذ
دُوب کا بستر بچھا ہے خوابِ عشرت کے لیے
زِندگی آزاد فرحت آشنا و باتمیز
بستیوں میں زَر کے لالچ میں بھٹکتی زندگی
کِس قدر بے آبرُو، بے خانماں، کِتنی غلیظ

(۲۷)

بستیاں

سوچتا ہُوں چھوڑ کر بستی کو بن میں جا بسُوں
کیا دھرا ہے بستیوں میں گندگی کے ماسوا
رات دِن محنت مُشقّت مالکوں کی گھُرکیاں
تُف ہے اِس جینے پہ، اس جینے سے مرجانا بھلا
کِس قدر دِلچسپ تھی، کِتنی جواں تھی زِندگی
ہم نے ہی اِس کو رہینِ درد و حرماں کر دیا

(۳۱)
بھکشا کی فضیلت

تو ہے جوگی، تجھ کو بھکشا مانگنا ذلت نہیں
دل سے لالچ، حرص و نخوت کو مٹا دیتی ہے یہ
ہر گلی ہر گھر میں ماں ہے، ہر بشر اپنا عزیز
پیار کرنے کا انوکھا گُر سکھا دیتی ہے یہ
پیار سے جتنی کوئی دے دے خوشی سے کر قبول
صبر کا احساس پہلو میں جگا دیتی ہے یہ

(۳۲)
ڈر سے نجات

زندگی کو موت کا ڈر، لطف کو آزار کا
پیار کو ہجرت کا ڈر، دولت کو ڈر سرکار کا
روپ، یووَن کو بڑھاپے کا لگا رہتا ہے ڈر
نام کو تہمت کا اور شہرت کو ڈر ادبار کا
ایک بیراگی کا دل آزاد ہے ہر خوف سے
اس کو کوئی ڈر نہیں، دھن دھام کا سرکار کا

(۳۳)
پورن آزادی

موت کے ڈر سے دبی رہتی ہے ہر دم زندگی
خوفِ پیری سے دبا رہتا ہے سہما سا شباب
حسن کے جلووں سے چکنا چور ہو جاتا ہے دل
ٹوٹ کر نابود ہو جاتا ہے مانندِ حباب
ہو اگر بیراگ تو آزاد ہو جاتا ہے دل
نے کوئی اُلجھن نہ بندھن اور نہ کوئی اضطراب

(۳۴)
چین کہاں

اِس جہاں کے عیش و عشرت جان و دل کے ہیں وبال
اِن کے لالچ میں جو ڈوبا وہ جیا تو کیا جیا
دھرمیں مر مر کے جینے میں نہیں ہے زندگی
روح ہو بے چین تو جینے سے مر جانا بھلا

(۳۵) برہم کا دھیان

ہیں چھلاوا ایک پل کا دہر کی رنگینیاں
ان میں دل کو مت لگا، دھوکا ہیں یہ دھوکا ہیں یہ
من کے مندر میں بسا لے مورتی بھگوان کی
حسن کے بت کچھ نہیں، مایا ہیں یہ مایا ہیں یہ

(۳۶) دُنیاوی عیش

ایک پل کی بات ہیں یہ دہر کے عیش و نشاط
جوں چمک بجلی کی یا جگنو کی جیسے روشنی
یا کمل کے پھول کی پتی پہ قطرہ آب کا
ایک پل بیتا تو مٹ جاتی ہے ان کی دلکشی

(۳۷) نُورِ وحدت

عشقِ خوباں، ناز و غمزہ، مال و زر، عیش و نشاط
جان لیوا ہیں یہ بندھن، دل کو ان سے دور رکھ
ہے فقط عشقِ حقیقی میں ہر اک دکھ سے نجات
اپنے دل کو نورِ وحدت سے سدا معمور رکھ

(۳۸) سُکھ کہاں

یاد کر وہ دن رہا جب اپنی ماں کی کوکھ میں
تنگی میں رات دن دبکا پڑا سوتا رہا
ہو کے پیدا نوجوانی میں ہوئی تجھ کو نصیب
پھر وہی جا جس میں اپنی جان و دل کھوتا رہا
حسن والوں کے سہے طعنے، ہوا بے آبرو
کس قباحت کے لیے مرتا رہا، روتا رہا
سوچ تو ناداں ذرا وہ کیا تھا جس کے واسطے
تند صحراؤں میں بارِ زندگی ڈھوتا رہا

(۳۹) نراشا کا جیون

تاک میں پیری ہے دورِ نوجوانی کی حریف
موت کے سائے میں مر مر کر گزرتی زندگی
پھر بھی انساں کس قدر غلطاں ہے حرص و آز میں
بیت جاتی ہے نراشا میں بھٹکتی زندگی

(۴۰)

یہ کشاکش کِس لیے

زِندگی بھر کیوں ہَوس کی آگ میں جلتے ہیں ہم
ڈھونڈھتے رہتے ہیں ہر دم مال و زر جاہ و جلال
جانتے ہیں اِس کشاکش کی کوئی منزل نہیں
یوں گنوا دیتے ہیں پھر بھی زِندگی کے ماہ و سال

(۴۲)

برہم کی مستی

برہم کی مستی سے تیرا دِل اگر سرشار ہے
دہر و جنّت کی حکومت کچھ نہیں تیرے لیے
کچھ نہیں دُنیائے فانی کی کروڑوں مستیاں
اِیسراؤں کی بھی وقعت کچھ نہیں تیرے لیے

(۴۳)

موت

بادشہ، قیصر، بہادر، شیر نر عالی وقار
عالِم و فاضِل، اکابِر، نُصرتوں کے جوش میں
ہو کے پژمُردہ، فسُردہ، ٹوٹ کے جاتے ہیں سبھی
غرق ہو جاتے ہیں یکسر موت کی آغوش میں

(۴۴)

موت ایک کھلاڑی

موت پانسے کا کھلاڑی، کھیل کی گوٹیں ہیں ہم
کھیلتیں کا کھیل ہم سے کھیلتا رہتا ہے وہ
یاں سے واں، پھر واں سے یاں، یہ سب اُسی کی چال ہے
ہم کو یوں چالوں میں اپنی ریلتا رہتا ہے وہ

(۴۵)

گیان

کیا ہے طفلی، نوجوانی، کیا ہے پِیری، کیا ممات؟
کیا کبھی سوچے ہیں ناداں! اِن سوالوں کے جواب
رات دِن کے چکّروں میں یوں بتا دی زِندگی
جوں جھپک یا نیم مدہوشی کا اِک بھولا سا خواب

(۴۶) حرصِ زر

ایک ہی رٹ میں لگا رہتا ہے رسندن آدمی
گو نئی سج دھج سے آتی ہے ہر اک شام و سحر
بے حیا کھاتا ہے در در حرصِ زر میں ٹھوکریں
اس کے دِل پہ کیوں نہیں احساسِ ذلّت کا اثر

(۴۷) عشق

ہو حقیقی یا مجازی، عشق آخر عشق ہے
عشق کی مستی سے اپنا دِل سدا مخمور رکھ
کر حسینوں سے محبت یا خدا کی ذات سے
یعنی اِس بستی کو جلووں سے سدا معمور رکھ

(۴۸) زندگی اکارت گئی

سوچ ناداں! اِس جہاں میں آکے تو نے کیا کیا؟
کیوں فقط حرص و ہوس میں ہی بتا دی زندگی
عشق پریوں سے، نہ کوئی معرکہ نے علم و فن
کیا ہوئی تیری جوانی، کیوں گنوا دی زندگی

(۴۹) محرومی

دولتِ علم و ہنر سے بھی رہا محروم تو
اور نہ تھا حاصل حسینوں کا کبھی لطفِ وصال
غیر کے رحم و کرم پر ہی رہی تیری نظر
زندگی تیری تھی گویا ایک کوّے کی مثال

(۵۰) وصالِ مرگ

چل بسے ماں باپ بھی، بھائی بہن بھی، دوست بھی
ذہن میں بس رہ گئیں دھندلی سی کچھ پرچھائیاں
کٹ رہے ہیں ہم بھی دریا کے کناروں کی طرح
منتظر ہیں اب وصالِ مرگ کی تنہائیاں

بلراج ورما

مِلے سُر میرا تمہارا

ہم اکثر اُن اِمکانات کو موسیقی سے وابستہ کرتے ہیں جن کی بدولت اِنسانوں کے درمیان امن وامان اور قریب آنے کی صورت حال پیدا ہوتی ہے یا جو محض افراد تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ بڑے بڑے گروہوں اور قوموں کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ کچھ اداروں نے موسیقی کی اِس خوبی کا فنِ تعلیم میں بھی فائدہ اُٹھایا ہے۔ موسیقی میں نہ صرف مثبت خوبیاں ہوتی ہیں بلکہ کئی منفی اور اِنتہائی خطرناک اور تباہ کن خاصیتیں بھی اِس سے وابستہ ہیں۔ اِن خاصیتوں میں قابلِ ذکر ہیں جنگ کے دوران جنگی صلاحیت کو جوش وخروش دِلانا یا افراد اور حالات کا ایسی خصوصی تخلیقات کے ذریعے سے مذاق اُڑانا جنھیں ”پھبتی کے گیت“ کہا جاتا ہے۔ اور یہ گیت ایسے ہیں جنھیں افراد اور گروہوں کی پھبتی اُڑانے کے لیے تو کیا اُن کی ہتک کرنے کے لیے بھی گایا جاتا ہے۔ لہٰذا اِس میں شک نہیں کہ موسیقی عوام کو سماجی سطح پر ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے جس کا سب سے نمایاں ثبوت ہندوؤں کے مندروں، عیسائیوں کے گرجا گھروں اور سکھوں کے گوردواروں جیسے معبدوں میں اجتماعی نوعیت کے گانے بجانے میں ملتا ہے۔

ہندوستان کے مندروں سے وابستہ موسیقی کے فن، سائنس، جمالیات اور سماجیات کا آغاز اکثر SAMAN CHANTS میں تلاش کیا جاتا ہے جو ویدک کال میں مذہبی تقریبات اور رسومات کا حصہ تھے۔ ڈاکٹر جی۔ ایم۔ تار لیکر نے

SAMAN CHANTS پر اپنی تصنیف میں ان نغموں سے چند بہت ہی مثبت عوامل کو منسوب کیا ہے، جیسے اِنسان اور عناصر کے باہمی اِتحاد کی ضرورت۔ کیوں کہ یہی عناصر ویدک کال میں دیوی، دیوتاؤں کی طرح پوجے جاتے تھے۔ کوئی ڈیڑھ سو سال کے دوران اِس موضوع پر لکھے گئے ماہرین کے کارناموں پر اُن کے تبصرے نہ صرف مختلف موسیقیاتی اور رسوماتی زاویوں پر مبنی ہیں بلکہ تقریباً تمام بڑے ادبی اور سماجی پہلوؤں کا بھی احاطہ کرتے ہیں۔ عبرانی، افریقی، مصری، ناردیئی، جاپانی اور بالی جیسے دوسرے تمدنوں کے نغمے بھی اسی طرح معبودوں کو خوش کرنے کے لیے تیار کیے اور گائے جاتے تھے۔ اِنھیں کی بدولت اُن تہذیبوں کے مذہبی تفکر، فلسفہ اور ثقافت سے وابستہ اقدار کی ماہیئت کا ہم پر انکشاف ہوتا ہے۔

کسی مُلک میں وہاں کے فنون کا جو وقار ہوتا ہے اُسی سے درحقیقت اس کی ثقافت اور تہذیب کی نشاندہی ہوتی ہے۔ انگلینڈ کے ممتاز سنگیت کار سر آتھر سلیون نے ایک بار فن کو ایک ایسی دولتِ مشترکہ کہا تھا جس میں فنون کی تمام مملکتوں کا یکساں مرتبہ ہوتا ہے۔ سر آتھر کے الفاظ ہیں:

> "میرے خیال میں انسانی جذبات پر موسیقی کا اثر فوری، زیادہ قوی اور آفاقی ہوتا ہے۔"

موسیقی کی طاقت اور اثر کی وضاحت کے لیے بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ اگرچہ بہت سے لوگ اسے ایک گھریلو شغل یا زیادہ سے زیادہ اِسے کانوں کے لیے مسرت افزا تفریح سمجھتے ہیں، تاہم درحقیقت یہ اس سے کہیں زیادہ گہری چیز ہے۔ اِس کی وسیع، فوری داد و تحسین اور مقبولیت، اکثر اِس کی زیادہ سنجیدہ اور اہم خوبیوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ امن ہو کہ جنگ ہو موسیقی ایک متحرک قوت رہتی ہے۔ کون بھول سکتا ہے بنکم چندر کے "بندے ماترم" اور بسمل کے "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے" کو جن سے قبل از آزادی دور میں ہمارے محبانِ وطن کے دل و دماغ کھول اٹھتے تھے، یا کون بھول سکتا ہے اقبال کے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" یا ٹیگور کے "جن گن من" کو جن سے آج ہمارے دلوں میں حب الوطنی کا جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ سُر تال ہمارا ورثہ ہیں۔ جہاں پہلے دو نغمے ہماری تحریک آزادی میں ہمت و حوصلہ افزائی کے آلات کار

تھے وہاں آخری دو نغمے ہمارے لیے ایک آزاد جمہوریہ کے شہریوں کی حیثیت سے مایۂ ناز اور تحریک کے سرچشمہ ہیں۔ موسیقی میں وہ تمکنت ہے جو الفاظ کے طلسماتی دنیا میں بھی نہیں پائی جاتی۔

ہم نے ملہار اور دیپک وغیرہ جیسے راگوں کے بارے میں سن رکھا ہے جن سے بارش ہو جاتی تھی اور دیپک جل اٹھے تھے۔ ہم نے ان تجربات کے بارے میں بھی سن رکھا ہے جو جنوبی ہند کے موسیقاروں نے پودوں اور فصلوں کی نشو و نما کے سلسلے میں کیے تھے۔ اور دیکھا گیا تھا کہ موسیقی، پودوں کے تیزی سے اگنے اور پھلنے پھولنے میں واقعی معاون ثابت ہوئی تھی۔ موسیقی کو اکثر ان خوبیوں کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے جو روحانی یکسوئی کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ ہم اپنی عبادت موسیقی کے ذریعہ کرتے ہیں اور آج بھی ہم اپنے دیوتاؤں کی تشفی اور تسلّی موسیقی ہی سے کرتے ہیں۔ ہم خوشی کے دوران بھی گاتے ہیں اور اداسی کے عالم میں بھی۔ ایسے بھی گیت ہیں جو ہم شادی بیاہ جیسے خوشی کے مواقع پر گاتے ہیں یا ایسے گانے بھی ہیں جو ہم اپنے پیاروں کے مرجانے پر گاتے ہیں۔ ہم جنگ کرتے وقت بھی گاتے ہیں اور جب جنگ جیت لیتے ہیں تو بھی گاتے ہیں۔ فوجوں کی پسپائی کی تقریب کے لیے بھی ہمارے پاس موسیقی کے فن پارے ہیں۔

میں نے ایک پیاری کی مختصر سی کہانی کے لیے اس قدر طویل تمہید کیوں پیش کی ہے؟ یہ کہانی مجھے، ۱۹۵۶ء میں، نئی دہلی میں منعقد ہوئی یونیسکو جنرل کانفرنس کے دوران پولینڈ کے ایک باشندے نے سنائی تھی۔ مجھے اس کہانی کی سچائی کا پتہ نہیں، کیوں کہ میں نے اسے فریڈرک شوپن کے بارے میں کسی کتاب میں لکھا ہوا نہیں پایا۔ میں نے اس کہانی پر یقین کر لیا کیوں کہ مجھے یقین کرنا پسند تھا اور مجھے موسیقی کی اچھوتی قوت کا ذاتی طور سے بھی تجربہ تھا۔ لیجیے یہ کہانی:-

پرانے زمانے میں جب موسیقی ایک بادشاہ کی منزلت پر تھی اور شوپن اور اس کے موسیقار ساتھی یورپی سماج کے ممتاز طبقوں پر حکمراں تھے تو اس وقت ڈنمارک میں ایک رومن کیتھولک جوڑا رہتا تھا ان کے نام اہم نہیں لیکن ان کی کہانی اہم ہے۔ انھوں نے محبت کی بنا پر شادی کی تھی، اور تقریباً دس سال تک بڑی محبت کے ساتھ مل کر رہے۔ چوں کہ وہ دونوں

جاگیردارانہ خاندانوں سے تھے، جہاں کام کرنے کی ممانعت تھی، اس لیے وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی محبت میں ہی مگن رہتے تھے۔

تب اچانک کہیں کوئی واقعہ ہوگیا اور آپس میں محبت کرنے والے ایک دوسرے سے الگ ہوکر گویا دشمن بن گئے۔ ان کا دس سال کا "ہنی مون" ایک تنگ یادسی بن کے رہ گیا۔

لوگ نہیں جانتے کہ وہ پیار کیوں کرتے ہیں اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ نفرت کیوں کرتے ہیں۔ محبت اور نفرت کا کوئی معقول تجزیہ نہ کبھی کیا گیا ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دس سال پیشتر ان میں محبت ہوگئی تھی، اور محبت کا یہ برعکس یعنی نفرت بھی ان میں اسی طرح ہوگئی۔ جو حد سے زیادہ محبت کرتے ہیں وہ حد سے زیادہ نفرت بھی کر سکتے ہیں۔ نہ اس کی کوئی معقول وضاحت ہے نہ اس کی، کیوں کہ محبت اور نفرت دونوں میں عقلیت کا دخل ممکن نہیں ہوتا وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ چونکہ دونوں کے پاس دنیا کی ہر شے کثرت سے موجود تھی لہذا وہ ایک دوسرے کے سہارے پر نہیں تھے۔ چونکہ دونوں ابھی جوان تھے اور راہبانہ زندگی ان کے لیے ممکن نہیں تھی اس لیے دوستوں اور بزرگوں نے انھیں طلاق کا مشورہ دیا۔ اس عہد کے رومن کیتھولک خاص کر اس دائرے کے ممتاز لوگ جو اکثر خود روم کے پوپ کے ہاتھوں ہی رشتۂ ازدواج میں پروئے جاتے تھے، اپنے رشتۂ ازدواج کو اس عظیم شخصیت کی اجازت کے بغیر توڑ نہیں سکتے تھے۔

دونوں اپنی خاندانی گاڑیوں میں، قانونی علاحدگی حاصل کرنے کے لیے روم کی جانب چل نکلے۔ وہ "ویٹیکان سٹی" میں پہنچے اور مقامی دوستوں کے یہاں قیام کیا۔ انھیں بڑے پروہت نے سماعت دی۔ چونکہ وہ دوستانہ ترغیب اور مذہبی پند و نصائح کے ذریعے انھیں پھر سے ملانے میں ناکام رہے اس لیے انھوں نے انھیں ایک اور تاریخ پر آنے کو کہا اور بتایا کہ اگر وہ اس تاریخ تک ایک دوسرے کے قریب نہ آسکے تو وہ انھیں طلاق کی منظوری دے دیں گے۔

دن بڑی تیزی سے گزر گئے۔ مقررہ دن سے ایک دن پیشتر ان کے اپنے اپنے خاندانی دوست انھیں فریڈرک شوپن کا موسیقی پروگرام سنانے کے لیے گئے، نہ اُس

آدمی اور نہ عورت کو ہی یہ خیال آیا کہ دوسرا ابھی وہاں موجود ہوگا۔ جب سامعین بیٹھ گئے اور اس عظیم موسیقار کی اسٹیج پر آمد کا اظہار کرنے کے لیے روشنیاں کر دی گئیں تو انھوں نے بھی ایک دوسرے کو دیکھا۔

وہ عورت اپنے احباب سے کہنے لگی:

"مجھے شوپن سے کیا لینا دینا ہے۔ میں ابھی یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔ میں اپنی سانسیں اس بداخلاق کی سانسوں میں ملانا گوارا نہیں کر سکتی"۔

وہ آدمی بول اٹھا:

"یہ کمرہ میرے لیے دوزخ کی آگ بن گیا ہے کیونکہ وہ کم بخت بھی اسی میں بیٹھی ہوئی ہے"۔

وہ اس ہال سے نکل جانے کو تیار تو ہو گئے لیکن دونوں وہاں سے باہر نہ جا سکے کیوں کہ "شوپن کی شب" کی ایک شرط یہ بھی ہوا کرتی تھی کہ جب وہ اسٹیج پر آجاتے تو ہال کے دروازے مقفل کر دیے جائیں۔ لہذا ایسا ہی ہوا۔ اب نہ کوئی باہر جا سکتا تھا۔ نہ اندر آسکتا تھا۔

موسیقی کی کارروائی کا آغاز سامعین کے کھڑے ہو کر تعظیم بجالانے سے ہوا۔ کئی منٹوں تک تالیاں بجتی رہیں۔ آخر میں وہ عظیم موسیقار بولا: "آج میں ایک خاص الخاص نغمہ پیش کر رہا ہوں۔ یہ ایک سمفنی ہے، محبت کا سمفنی۔ جو محبت کرتے ہیں ان کے لیے یہ مسرت کا باعث ہوگا، جنھوں نے محبت کی ہے مگر اب اسے کھو چکے ہیں انھیں اپنے اچھے دنوں کا پھر سے احساس ہوگا اور وہ جسکی بدولت انھیں دنوں کی فضا میں چلے جائیں گے جب وہ مل کر رہتے تھے۔ چونکہ ہم سب زندگی سے محبت کرتے ہیں، لہذا میں آج کی پیش کش کو "دنیا کے عاشقوں اور محبوباؤں کے نام منسوب کرتا ہوں"۔

ان الفاظ کے ساتھ وہ ماہر موسیقار پیانو کے پاس اسٹول پر بیٹھ گیا، تمام روشنیاں گل کر دی گئیں صرف پیانو کے اوپر رکھی ہوئی بتی جل رہی تھی تاکہ وہ پیانو بجاتا ہوا دکھائی دیتا رہے۔

موسیقی شروع ہوگئی۔ ہال میں مکمل خاموشی چھاگئی۔ لوگوں نے گویا اپنی سانسیں روک لیں۔ وہ کسی لَے سے بھی بے بہرہ نہیں رہنا چاہتے تھے۔ وہ ماہر موسیقی کار پیانو بجانے میں محو ہو گیا۔ ایک سرمدی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ جوان اور بزرگ جوڑے بالکل نہ جانتے ہوئے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، اپنے ماضی میں کھوئے ہوئے ایک دوسرے کے ہاتھ دبا رہے تھے۔ وہ مسکرائے بھی نہیں۔ مسکراہٹ کوئی قہقہہ نہیں ہوتی، لیکن انھیں ڈر تھا کہ ایسا کرنے سے بھی شاید کوئی ہلکی سی آواز نکل جائے اور کوئی آواز بھی اس وقت ان آوازوں سے زیادہ قابل قدر نہیں تھی۔ جو پیانو سے نکل رہی تھیں۔ موسیقار کی لمبی، پتلی انگلیاں پیانو کی کنجیوں پر رقص کناں تھیں جیسے الپسرائیں ناچ رہی ہوں۔ کسی نے فرشتوں کو ساز بجاتے نہیں دیکھا لیکن اب وہ کسی قدر جان گئے تھے کہ فرشتے بھی اس سے بہتر کیا کر سکتے ہیں — یہ صورتِ حال کوئی گھنٹہ بھر ایسے ہی بنی رہی۔

وہ اپنے سمفنی کے آخری الاپ کے قریب ہو چلا تھا کہ ایک ہلکی سی چیخ نے فضا کا سارا طلسم توڑ دیا۔ اس نے پیانو بجانا بند کر دیا اور کھڑا ہو گیا۔ ساری روشنیاں جلا دی گئیں اب کسی کو بھی اُس منظر کو دیکھنے میں کوئی دقت نہ تھی۔

ڈنمارک کا وہ جوڑا دھیرے دھیرے چل کر فرش کے وسط تک چلا آیا تھا۔ انھوں نے نہ ایک دوسرے کو چلتے دیکھا، نہ ہی کسی اور نے۔ اب وہ ایک دوسرے سے بڑے تپاک کے ساتھ بغل گیر تھے۔ آدمی کے ہونٹوں نے عورت کے ہونٹوں کو مقفل کر رکھا تھا کسی کو کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ کسی بھی گہرے جذبے میں الفاظ آدمی کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

چرچ آف روم کا معزز سربراہ معتمد خداوندی کی طرح جانے کہاں سے نمودار ہو گیا ان محبت کے پُتلوں کو آشیرواد دینے کے لیے۔ "میں ایک بار پھر آپ لوگوں کو ایک دوسرے سے ملا رہا ہوں اور دعا کرتا ہوں آج کے بعد تم دونوں ایسے ہی بنے رہو جب تک ...." اس نے جملہ مکمل نہیں کیا۔

زندگی اپنے محور پر لوٹ آئی تھی۔ شوپن اسٹیج کے وسط آ کھڑا ہوا

تھا۔ اِس پر بار بار داد و تحسین کی بوچھاڑ کی گئی۔ تالیوں کی ایک گونج تھی جو ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ کھڑے کھڑے تعظیم کا یہ سلسلہ کئی منٹوں تک جاری رہا۔ شوپن کی چمکتی آنکھوں سے پگھلے موتی جھڑ رہے تھے۔ اسے اس مقدس سربراہ نے اِس جوڑے کے بارے میں سب کچھ بتا رکھا تھا۔ اُسے لگا گویا اُسے اپنا انعام مِل گیا ہو۔

(پیارے قاری! کیا یہ کہانی آپ کو یقین نہیں دِلاتی کہ اِنسانی جذبات پر موسیقی کا سب سے قوی، آفاقی اور فوری اثر ہوتا ہے۔)

TANAZUR

Registered with the Registrar of News Papers in India

TANAZUR PUBLICATIONS

24-D, Pocket-III, Mayur Vihar, Phase-I, Delhi-91 Phone : 2252319